دکھنی ہندو اور اردو

از

نصیر الدین ہاشمی

سلسلۂ تصانیف ادارۂ ادبیاتِ اردو نمبر (۲۵۱)

دکنی ہندو اور اردو

جس میں

دکن کے ان ہندو شاعروں، نثرنگاروں اور ایڈیٹروں
وغیرہ کے مختصر حالات اور نمونہ کلام درج ہے جنہوں
نے اردو زبان اور ادب کی خدمت کی ہے

از

نصیر الدین ہاشمی

بارِ اوّل ——— (۵۰۰)

قیمت ۸/ــــ تین روپیہ پچاس نئے پیسے

ملنے کا پتہ

سب رس کتاب گھر ادارۂ ادبیاتِ اردو

خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

مطبوعہ

مطبع ابراہیمیہ

اسٹیشن روڈ۔ حیدرآباد (آندھرا)

فہرست

فرزندانِ جامعہ عثمانیہ

خواتین

۳ - اخبارات و رسائل اور انکے ایڈیٹر

۴ - وکلاء ایڈووکیٹ

پیش لفظ

(از فضیلت مآب ہز اکسلنسی بی، رام کرشنا راؤ صاحب گورنر کرالا)

میں نصیر الدین ہاشمی کو اس وقت سے جانتا ہوں جب کہ وہ طالب علم تھے اور میرا بھی تعلیمی زمانہ تھا۔ دوران تعلیم ہی میں ہاشمی صاحب کو ان کے خاندانی روایات کے بموجب علم سے بڑی دلچسپی رہی۔ دارالعلوم کی "یونین" "ثمرۃ الادب" کے وہ عرصہ تک سکریٹری رہے اور ایک علمی رسالہ "ثمرۃ الادب" کے نام سے شائع کرتے رہے۔ یم نرسنگ راؤ صاحب ان کے شریک کار تھے دونوں کی جدوجہد سے انجمن ثمرۃ الادب نے بڑی ترقی کی تھی۔

ختم تعلیم کے بعد جب ہاشمی صاحب ملازمت کے دائرہ میں منسلک ہوئے تو ان کا علمی شغف بڑھ گیا۔ چنانچہ "دکن میں اردو" شائع کی گئی یہ کتاب بڑی مقبول ہوئی اس کے بعد ہی "پنجاب میں اردو" "بہار میں اردو" وغیرہ کتابیں لکھی گئیں حکومت آصفیہ نے "دکن میں اردو" کی تالیف کے صلہ میں ہاشمی صاحب کو یورپ روانہ کیا تاکہ وہاں کے کتب خانوں سے اردو کی قلمی کتابوں سے مواد فراہم کریں چنانچہ انہوں نے اس مواد سے "یورپ میں دکھنی مخطوطات" شائع کی جو تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے "دکن میں اردو" کی طرح مفید اور کارآمد ثابت ہوئی ہے۔

ہاشمی صاحب کی ملازمت سررشتہ تعلیمات یا یونیورسٹی سے متعلق نہیں رہی،

اس کے باوجود انہوں نے اپنے علمی شغف اور دلچسپی کے باعث تیس سال کے دوران ملازمت میں بیس پچیس کتابیں شائع کردیں اور پانچ سو سے زیادہ مضامین لکھے۔ پچپن سال کی عمر میں ملازمت سے سبکدوش ہونے پر ان کے علمی کاموں میں اضافہ ہوگیا۔ انجمن ترقی اردو کے ایما سے حیدرآباد سنٹرل لائبریری اور کتب خانہ سالارجنگ وغیرہ کی اردو کتابوں کی وضاحتی فہرستیں مرتب کیں۔ سالارجنگ کے کتب خانہ کی وضاحتی ضخیم فہرست شایع ہوچکی ہے۔

ہاشمی صاحب نے خصوصیت سے دو موضوع اپنے لئے منتخب کئے ہیں۔ دکن میں اردو کے ارتقا کی تاریخ اور دکن کی تاریخ۔ ان کے اسی شغف کے مدنظر تاریخ آزادی ہند کے سلسلہ میں ان کو ریسرچ اسکالر منتخب کیا گیا اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ ان کے خدمات پسندیدہ ثابت ہوئے۔

ہاشمی صاحب کی زیر بحث کتاب "دکھنی ہندو اور اردو" ایک دلچسپ اور معلومات آفریں کتاب ہے جیسا کہ میں نے کئی بار اپنی تقریروں میں بیان کیا ہے حیدرآباد پانچ زبانوں کا سنگم رہا ہے اور پھر ان زبانوں کے ادیبوں میں اتحاد اور دوستی رہی جس کا بڑا اچھا اثر ہوا۔

حیدرآباد میں اردو کا رواج صدیوں سے ہے قطب شاہی دور کے بیسیوں شاعر اور ادیب آج تک مشہور ہیں اور ان کی تصانیف اردو ادب میں بلند مقام رکھتی ہیں۔ حکومت آصفیہ میں سو سال تک اردو زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیدیا گیا تھا اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے جامعہ عثمانیہ بھی قائم کی گئی۔ اس کے علاوہ حیدرآباد کے کلچر کا تقاضا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی اردو سے دلچسپی لیتے۔ چنانچہ کئی ہندو اصحاب نے اردو شاعری میں نام آوری حاصل کی مثلاً مہاراجہ چندو لال شاداں تخلص۔ مہاراجہ کشن پرشاد، شاد تخلص۔ وغیرہ نے بڑی شہرت حاصل کی۔ شاعروں

کی طرح نثر نگاری میں بھی مانک راؤ وٹھل اور راجیشور راؤ اصغر وغیرہ نے اپنے قلم کی جولانیاں پیش کی ہیں۔

ہاشمی صاحب کی اس تصنیف سے ثابت ہوتا ہے کہ بیسیوں ہندو شعراء اور ادیب اردو کی خدمت میں کمربستہ تھے نہ صرف مرد بلکہ خواتین بھی اس میدان میں نظر آتی ہیں اور اردو کے پہلے اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ایک ہندو ہی نے سبقت کی تھی۔ جامعہ عثمانیہ کے بیسیوں یم۔اے اور یم ایڈ وغیرہ کے طلباء نے مفید مقالے قلمبند کئے اور سیاسی میدان کے رہنما پنڈت کیشو راؤ مسٹر وامن نایک وغیرہ اردو میں بھی اپنی تحریک کو فروغ دیتے رہے۔ صدہا وکلاء نے شہرت حاصل کی۔ بہرحال ہندو اصحاب نے اردو کی بڑی خدمت کی ہے۔

ہاشمی صاحب نے ان سب امور کو تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں بیان کیا ہے۔ اور بڑی تلاش اور جستجو سے مواد فراہم کیا ہے۔ مولف صاحب کا اسلوب ہمیشہ عام فہم اور سلیس رہا ہے جس کی بڑی ضرورت ہے۔ ان کی محنت قابل داد اور لائق ستائش ہے۔ مجھے توقع ہے کہ ان کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی مقبول ہوگی اور "آندھرا پردیش" میں اردو کو اس کا جائز مقام ملے گا۔ تلنگی اور ہندی ادیبوں کو بھی اس سے مدد ملے گی۔ بہرحال میں ہاشمی صاحب کو ان کی اس کتاب پر دلی مبارکباد دیتا ہوں اور امید ہے کہ آندھرا حکومت بھی اس کی قدر کرے گی فقط

بی رام کشن راؤ

مقدمہ

از جناب پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ

مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب، تقریباً گذشتہ چالیس برس سے اردو ادب کی خدمت میں ہمہ تن منہمک ہیں۔ حیدر آباد کے موجودہ اہل قلم حضرات میں، غالباً وہ سب سے قدیم مصنف ہیں۔ ہاشمی صاحب کی طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی ہے اور ان کے قلم کی روانی قابل رشک ہے۔ چنانچہ ان کی تصانیف میں سے کم و بیش دو درجن کے قریب کتابیں جو مستقل موضوعات پر ہیں، شائع ہو چکی ہیں۔ انھیں میں "دکن میں اردو" "یورپ میں دکھنی مخطوطات" جیسی مستند اور مفید کتابیں اور مقالات کا ایک مجموعہ بھی شامل ہے۔ ہاشمی صاحب کے مقالات جو وقتاً فوقتاً مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں اور جو کتابی صورت میں شائع نہیں ہو سکے، ان کی تعداد ساڑھے پانچ سو سے زیادہ ہے۔ حال ہی میں انجمن ترقی اردو (علی گڈھ) کے ایما پر ہاشمی صاحب نے کتب خانہ آصفیہ، حیدر آباد دکن (حیدر آباد اسٹیٹ لائبریری) اور سالار جنگ اسٹیٹ لائبریری، حیدر آباد دکن، کے اردو مخطوطات کی ضخیم توضیحی فہرستیں بھی مرتب کی ہیں، جو ابھی طبع نہیں ہوئیں[۱]۔ ان توضیحی فہرستوں

---

[۱] ۔ نواب سالار جنگ کے کتب خانہ کی فہرست اب شائع ہو گئی ہے۔

کے علاوہ، کوئی پانچ سات تصانیف اور بھی ہیں، جو مسودوں کی شکل میں ہیں۔

ہاشمی صاحب نے یوں تو دکھنی ادب، تاریخ اور خواتین دکن کی علمی، ادبی اور سماجی خدمات پر بہت کچھ لکھا ہے، جس کے باعث مختلف حلقوں میں، ان کی علمی خدمات کے مختلف پہلو اہمیت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ کہیں وہ دکھنی ادب کے مستند مصنف مانے جاتے ہیں۔ بعض حلقوں میں وہ خواتین کی علمی اور ادبی خدمات پر لکھنے والے مخصوص مصنف تصور کئے جاتے ہیں اور بعض حضرات کی نظر میں وہ دکن کی تاریخ اور تمدن پر لکھنے والے مصنف ہیں۔ میری اپنی رائے میں ہاشمی صاحب کی دکھنی ادب پر تصانیف بڑی اہمیت کی مالک ہیں۔ ان کی کتاب "دکن میں اردو" اس موضوع پر اولین تصنیف ہے، چنانچہ شمالی ہند کے ادبی حلقوں میں وہ مصنفِ "دکن میں اردو" کی حیثیت ہی سے زیادہ متعارف اور مشہور ہیں۔ "دکن میں اردو" جو آج سے بتیس سال پہلے شائع ہوئی تھی، اپنے اچھوتے موضوع کی وجہ سے، شائع ہوتے ہی مقبول ہو گئی۔

حیدرآباد کی حکومت نے، اس کتاب کی اشاعت کے بعد، اسی موضوع پر مزید تحقیق کرنے کے لئے انھیں انگلستان اور یورپ بھیجا۔ یورپ کے کتب خانوں میں ان کی تحقیق اور تلاش کے نتائج، "یورپ میں دکھنی مخطوطات" کے نام سے شائع ہوئے۔ یہ کتاب اب خاصی اہمیت حاصل کر چکی ہے اور ہندستان میں، اس موضوع پر تحقیق کرنے والوں کے لئے ایک حوالے کی کتاب بن گئی ہے۔ "دکن میں اردو" کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ، اس کتاب کے بعد، مختلف صوبوں میں اردو کے نشو و نما پر جو کتابیں شائع ہوئیں، ان کے نام اسی نمونے پر رکھے جا رہے ہیں۔ ان میں "پنجاب میں اردو" "بہار میں اردو" اور "بنگال میں اردو" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ہاشمی صاحب کو تاریخ سے جو دلچسپی ہے، اس کی بدولت حکومتِ ہند کی جانب سے آزادی ہند کی جو تاریخ مرتب کی جارہی ہے اس میں مدد دینے کے لئے بھی انھیں مامور کیا گیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب' ہاشمی صاحب کی ادبی کاوشوں میں ایک بیش بہا اضافہ ہے اس کتاب کو دیکھنے سے پہلے' میری طرح غالبًا اور حضرات کو بھی اس کا اندازہ نہیں ہوا ہوگا کہ دکن میں اردو کے ہندو ادیبوں اور شاعروں کی اتنی بڑی تعداد دستیاب ہوسکتی ہے کہ ان کا ایک اچھا خاصہ تذکرہ لکھا جاسکتا ہے۔ اب تک اردو کے ہندو ادیبوں اور شاعروں کے عام طور پر ایک دو تذکرے لکھے جاچکے ہیں، لیکن دکن کے ہندو ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں ہماری معلومات ادھوری اور تشنہ تھیں ہاشمی صاحب کی سعی کی بدولت' اردو کی ادبی تاریخ کا یہ اہم پہلو بھی اب ہمارے سامنے آگیا ہے۔

دکن میں اردو کے ہندو ادیبوں اور شاعروں کی اس طویل فہرست، اور ان کے مختلف النوع کارناموں پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے' ہم کو اس کا اچھا احساس ہو جاتا ہے کہ اردو زبان واقعتًا کسی طبقے اور فرقے یا مذہبی گروہ کی مخصوص زبان نہیں دکن کی سرزمین میں بھی اس زبان میں لکھنے والوں میں سب ہی طبقوں اور مذاہب کے لوگ شامل ہیں' ان میں ہندو بھی ہیں' مسلمان' عیسائی اور پارسی بھی۔ پھر اس گروہ میں دکن کی ساری زبانیں بولنے والے شامل ہیں۔ اردو ان مختلف زبانیں بولنے والوں کے درمیان ایک مشترک واسطے کا کام کرتی رہی۔ دکن میں اردو کے ہندو ادیبوں اور شاعروں کی تعداد' دوسرے گروہوں کے لکھنے والوں کی تعداد سے کچھ کم نہیں۔ اور یہ بڑی تعداد' علمی اور ادبی جد وجہد کے تقریبًا ہر شعبے پر حاوی ہے۔ اس میں ادیب بھی ہیں' شاعر بھی ہیں اور صحیفہ نگار بھی۔ اردو کے قانونی اور تاریخی ادب میں ان کی مساعی نے خاطر خواہ اضافہ کیا شعر وسخن کے میدان میں بھی دکن کے ہندو شاعر' ہمیشہ

پیش پیش رہے۔

کتاب سات ادوار پر تقسیم کی گئی۔ پہلا دور بہمنی عہد کے اردو ادب سے شروع ہوتا ہے، لیکن اس دور کا کوئی ہندو ادیب یا شاعر مصنف کو دستیاب نہ ہو سکا۔ دوسرا دور عادل شاہی اور قطب شاہی عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ مصنف کی تلاش نے اس دور کا ایک ہندو شاعر ڈھونڈھ نکالا۔ اس عہد سے لے کر، موجودہ زمانے تک سینکڑوں ہندو ادیب اور شاعر ہوئے، جنھوں نے علم اور ادب کے ہر شعبے میں اپنے افکار چھوڑے ہیں اور ان کا تفصیلی تذکرہ قارئین کو آگے کے صفحات میں ملے گا۔ ان ادیبوں، شاعروں اور عالموں میں سے اکثر ایسے ہیں، جن کے کارنامے بڑی اہمیت کے مالک ہیں۔

ان اعتبارات سے یہ مختصر سی کتاب نہایت معلومات آفریں کتاب ہے۔ اس کی اشاعت سے دکن کی ادبی تاریخ کا یہ نہایت اہم پہلو منظر عام پر آجاتا ہے کہ دکن میں بھی، اس زبان اور اس کے علم و ادب کو سینچنے اور پروان چڑھانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی مساعی کا ساتھ رہا۔

مجھے توقع ہے کہ اردو کی ادبی تاریخ میں اس کتاب کو بڑی اہمیت حاصل ہوگی اور ہاشمی صاحب کی یہ سعی بنظر استحسان دیکھی جائے گی۔

عبدالقادر سروری

حمایت نگر۔ حیدرآباد دکن

۲۹ / مئی ۱۹۵۶ء

الف
معروضۂ مو

سنہ ۱۹۳۱ء میں خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی نے ایک کتاب "ہندو شعرا" کے نام سے شائع کی تھی، چونکہ اس میں دکن کے صرف ایک دو ہندو شعرا کا حال لکھا گیا تھا، اس سے میں نے ایک مضمون کی صورت میں دکن کے اردو گو ہندو شعرا کا مختصر حال قلمبند کیا جو رسالہ " ہندوستانی" الہ آباد میں سنہ ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔

گذشتہ پندرہ سال میں نہ صرف جدید معلومات کا اضافہ ہوا اور بعض شعرا نے خصوصی شہرت حاصل کرلی، بلکہ سب سے بڑی تبدیلی ہندوستان کی آزادی اور پھر اس کی لسانی تقسیم ہے۔

اگرچہ پورا ہندوستان ایک وحدت ہے، اور جمہوریہ ہند تمام ہندوستان کے حصوں پر مشتمل ہے، لیکن اس کا جنوبی حصہ " دکن " کہلاتا ہے، اور یہ وہ سطح مرتفع ہے جو دریائے نربدا کے جنوب میں واقع ہے اور بہر لحاظ اونچی پہاڑیوں سے جن کو مشرقی اور مغربی گھاٹ کہتے ہیں گھرا ہوا ہے۔

ایک زمانہ تک " سلطنت آصفیہ " کو بھی دکن سے موسوم کیا جاتا تھا، لیکن دراصل دکن میں ہندوستان کے جنوب کا بڑا علاقہ شامل ہے، چنانچہ اسی لئے میری کتاب " دکن میں اردو " میں بھی " دکن " کے پورے علاقہ پر روشنی ڈالی گئی اور اردو کی ابتدا اور ارتقا کی تفصیل کی گئی ہے، اس کا چوتھا ایڈیشن بہت کچھ اضافہ کے ساتھ سنہ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا ہے، اگرچہ " دکن میں اردو " میں چند ہندو شعرا اور نثر نگاروں

کا حال درج ہے، لیکن اس امر کی ضرورت تھی کہ دکن کے تمام قدیم اور جدید ہندو شعرا اور نثر نگاروں کو ایک جگہ پیش کیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ دکن میں بھی ہندو اصحاب نے اردو زبان کی ترقی میں اسی طرح حصہ لیا ہے جس طرح کہ شمالی ہند میں۔

اس کتاب میں ان تمام ہندو شعرا، اور نثر نگاروں کا تعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے جو دکن سے متعلق ہیں، لیکن اس امر کا خیال رہے کہ ان کی بڑی تعداد آندھراپردیش سے متعلق ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ دکن کے بجائے آندھرا دیش نام رکھا جاتا، مگر چونکہ اس میں گزشتہ ڈیڑھ دو صدی کی اردو کا تذکرہ کیا گیا ہے جس میں مہاراشٹر اور کرناٹک کے ہندو شعرا اور نثر نگار بھی شامل ہیں، اس لیے نفس مضمون کے لحاظ سے صحیح نام "دکھنی ہندو اور اردو" تجویز کیا گیا ہے، اور نیز چونکہ اس کتاب میں ۱۹۵۶ء کے قبل کا تذکرہ ہے جبکہ آندھرا دیش نہیں بنا تھا، اس لیے بھی ہمارا نام غیر موزوں نہیں ہے۔

اس مقالہ سے یہ واضح ہوگا کہ دکن کے ہندو شعرا اور نثر نگاروں نے اردو زبان کی کیسی اہم اور مہتم بالشان خدمات انجام دے ہیں، خصوصاً جبکہ کئی ہندو اصحاب ایسے ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے، اولاً ارادہ تھا کہ صرف شعرا کا تعارف کرایا جائے، مگر چونکہ میری کتابوں "دکن میں اردو" "مدراس میں اردو" "خواتین دکن کی اردو خدمات" میں شعرا، نثر نگاروں اور اخبار کے ایڈیٹروں وغیرہ کا تذکرہ ہوا ہے، اور اس کو ہمدردان اردو نے قدر کی نگاہوں سے دیکھا ہے، اسی لئے مناسب معلوم ہوا کہ اسی نہج پر زیر نظر کتاب کو مرتب کیا جائے تاکہ دکھنی ہندوؤں کی وہ تمام کوششیں جو اردو سے متعلق ہیں ایک جگہ اجاگر ہو جائیں۔

اگرچہ میں نے اپنی معلومات کی حد تک تمام ہندو شعرا اور نثر نگاروں کو پیش

کرنے کی کوشش کی ہے، مگر یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ تمام ہندو ادیبوں کو شامل کر لیا گیا ہے جو اردو کی خدمت میں مصروف و منہمک ہیں، تاہم بڑی حد تک کوشش کی گئی ہے کہ مشہور اہل قلم کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

مجھے توقع ہے کہ میری یہ کتاب بھی دوسری کتابوں کی طرح مقبولیت حاصل کریگی اور آندھرا دیش میں اردو کے مستقبل کو شاندار بنانے کی توقعات کی ضامن ہوگی۔

اس "معروضہ" کو ختم کرنے سے پیشتر میں ہزاکسلنسی فضیلت مآب بی رام کشن راؤ صاحب گورنر کرالا کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری استدعا کو منظور فرماکر پیش لفظ لکھنے کی زحمت گوارہ فرمائی۔ نیز مجھی پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب کا "مقدمہ" کے لکھنے کے لئے اور مشفقی ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ کا ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے اس کو شایع کرنے کے لئے شکریہ ادا کرتا ہوں

یکم جنوری ۱۹۵۸ء
کٹل منڈی۔ حیدرآباد دکن

ہاشمی

دکنی ہندو اور اردو

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اردو ہندو اور مسلم کے اتحاد سے پیدا ہوئی ہے، اسی لئے اردو شعرا اور نثر نگاروں میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے نام بھی نظر آتے ہیں۔

"دکن میں اردو" کی چوتھی اشاعت میں جو ۱۹۵۴ء میں ہوئی ہے کئی ہندو شعراء اور نثر نگاروں کے نام اور ان کا نمونہ کلام درج ہوا ہے، اگرچہ کہ "دکن میں اردو" شعراء کا تذکرہ نہیں ہے، اس لئے دکن کے تمام ہندو شعرا یا نثر نگاروں کا اس میں ذکر نہیں ہے۔

یہاں ہم ان ہندو شعرا اور نثر نگار ادیبوں کو متعارف کراتے ہیں جن کی اردو خدمات سے ہم واقف ہیں، امید ہے کہ یہ تفصیل موجب دلچسپی ہوگی۔

"دکن میں اردو" میں اردو کی ابتدا اور ارتقا سات ادوار کے تحت بتائی گئی ہے جس کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) پہلا دور سنہ ۷۴۷ھ / ۱۳۴۷ء تا سنہ ۹۰۰ھ / ۱۵۹۵ء

(۲) دوسرا دور سنہ ۹۰۰ھ / ۱۵۹۵ء تا سنہ ۱۱۰۰ھ / ۱۶۸۸ء

(۳) تیسرا دور سنہ ۱۱۰۰ھ / ۱۶۸۸ء تا سنہ ۱۱۳۶ھ / ۱۷۲۴ء

(۴) چوتھا دور سنہ ۱۱۳۶ھ / ۱۷۲۴ء تا سنہ ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء

(۵) پانچواں دور سنہ ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء تا سنہ ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۳ء

(۶) چھٹا دور سنہ ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۳ء تا سنہ ۱۳۳۶ھ / ۱۹۱۸ء

(۷) ساتواں دور سنہ ۱۳۳۶ھ / ۱۹۱۸ء تا سنہ ۱۳۷۵ھ / ۱۹۵۵ء

شاعری

"دکن میں اردو" سے اس امر کی تفصیل معلوم ہو سکتی ہے کہ ہم نے کیوں سات دور قرار دیئے ہیں۔ یہاں اس سے قطع نظر ہم ہر دور کے ہندو شعرا کا تعارف کراتے ہیں۔

پہلے دور میں کسی ہندو شاعر کا نام ہم کو دستیاب نہیں ہوا۔ دوسرے دور کے اکثر شعرا کے ناموں سے ہم واقف نہیں ہیں۔ کیونکہ صرف تخلص ہی سے انکا کلام متعارف ہے اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں کون کون مسلمان تھے اور کون کون ہندو، البتہ اس دور کے صرف ایک شاعر رام راؤ سے واقف ہیں جن کا تخلص "سیوا" تھا۔ واقعات کربلا میں انھوں نے ایک مثنوی لکھی تھی، جو اب نایاب ہے۔ اسٹوارٹ نے اپنی کیٹلاگ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

تیسرے دور میں ہم لالہ جسونت رائے المتخلص بہ "منشی" کو شاعر کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔

(۱) منشی اورنگ زیب عالمگیر کے جنوبی ہند فتح کرنے کے بعد یہاں کے گورنر سعادت اللہ خاں بنائے گئے تھے۔ اُن کو شعر و سخن سے بڑی دلچسپی تھی۔ ان کے دربار میں شعرا کے کلام پر مباحثہ ہوتا۔ گولکنڈہ اور بیجاپور کے قدیم شعرا وجہی، غواصی، نصرتی کے تصانیف کا ذکر رہا کرتا، ان کی شاعری پر تنقید ہوتی۔ سعادت اللہ خاں خود بھی شاعر تھے۔ شاعری کا اچھا اور پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ فی البدیہہ شعر کہا کرتے۔ ایک مرتبہ بیجاپور کے شاعر عبداللہ ذاکر نے اپنی درخواست نظم میں پیش کی، اس پر انھوں نے اسی بحر میں تجویز فرمائی۔ محرم میں اکثر اوقات دکھنی زبان میں مرثیے کہا کرتے جو فصاحت اور بلاغت کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہوتے تھے۔

مگر افسوس یہ سب اب ناپید ہیں، صرف تاریخوں سے انکی وضاحت ہوتی ہے۔

ان کے زمانے میں فارسی کے باکمال شعرا ارکاٹ میں جمع ہو گئے تھے جن میں قزلباش خاں، فضل اللہ خاں، آقا محمد مقیم، دکھنی رائے، بسنت رائے، محمد امین اسرائیلی وغیرہ مشہور تھے۔

سنہ ۱۱۱۸ھ کے بعد عالمگیری عہد بہت جلد ختم ہو گیا۔ یعنے سعادت اللہ خاں کے گورنری کا زمانہ اختتام کو پہنچ گیا۔ اگر ہم ان کے زمانے کے اردو شعرا پر نظر ڈالیں تو ہم کو اس وقت تک صرف ایک نام ملتا ہے، اور وہ لالہ جسونت رائے منشی تخلص کا ہے۔

لالہ جسونت رائے منشی کے متعلق ہمیں زیادہ تفصیلی حالات نہیں ملتے۔ خزانہ عامرہ (تذکرہ مولانا غلام علی آزاد) میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ تذکرہ جات، صبیح وطن، گلزار اعظم جو خصوصیت سے ارکاٹ کے فارسی شعراء کے حالات پر مشتمل ہیں۔ ان میں بھی منشی کے حالات نہیں ہیں، جو حالات ہم کو معلوم ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

لالہ جسونت رائے نام اور منشی تخلص تھا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ سعادت اللہ خاں گورنر ارکاٹ کے دربار سے تعلق تھا۔ اعلیٰ خدمات سے سرفراز تھے۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ سعادت اللہ خاں کے حالات میں ایک ضخیم کتاب "سعید نامہ" لکھی ہے اس میں ان کے کئی قصیدے بھی شامل ہیں جو مختلف موقعوں پر پیش کیے گئے تھے۔ ان قصائد کے دیکھنے سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ منشی فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ انھوں نے ایک مثنوی بھی فارسی میں قلمبند کی ہے جس کا نام "گل کدہ عشق" ہے جو غواصی کی دکھنی مثنوی سیف الملوک سے اخذ کی گئی تھی۔[1]

منشی نہ صرف شاعر تھے بلکہ ایک بلند پایہ انشاء پرداز بھی تھے۔ محمد امین

---

[1] سعید نامہ

اسٹر اُسلی کا تعلق ان کے دفتر ہی سے تھا۔ محمد امین نے ایک کتاب "گلشن سعادت" نام کی لکھی ہے۔ اس میں اس زمانے کے خطوط ہیں۔ ان میں لالہ جسونت رائے کے خطوط بھی ہیں، ان سے بھی منشی کی فارسی قابلیت کا بخوبی ثبوت ملتا ہے۔

افسوس ہے کہ ہم کو یہ نہیں معلوم منشی کب پیدا ہوئے اور کب شاعری آغاز کی اور کب انتقال کیا، کن سے تلمذ حاصل تھا۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ اس زمانے میں دکن میں عام طور سے اردو مروج تھی اور بیجاپور و گولکنڈہ کے شاعر اب اورنگ آباد اور برہان پور میں جمع ہو گئے تھے۔ مغلیہ حکومت کا شیرازہ اگرچہ پوری طرح پراگندہ نہیں ہوا تھا مگر پھر بھی زوال کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ مغلیہ تمدن اور تہذیب موجود تھی۔ شمال سے جنوب تک اس تمدن کا اثر پوری طرح نمایاں تھا، جو ماحول اور معاشرت اس زمانے میں تھی اس کے مطابق اس زمانے میں شاعری ہوتی تھی۔ قومی مفاد، ذاتی مفاد ہوتا، ادب کی افادیت ذاتی آسودگی ہوتی تھی۔ وطنیت اور قومیت کا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ اس کا احساس تک کسی کو نہیں ہو سکتا تھا۔ عیش و عشرت طرب و نشاط کا بازار گرم رہا کرتا۔ ساقی و شاہد سے کام رہتا تھا۔ ظاہر ہے ایسے ماحول اور فضا میں شاعری بجز تغزل کے کچھ اور پیش نہیں کر سکتی تھی۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے جسونت رائے فارسی کے ساتھ اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ انھوں نے اردو میں ایک مثنوی "گلدستۂ عشق" کے نام سے ۱۱۲۹ھ میں تصنیف کی ہے، یہ نایاب ہے مگر اس کے اشعار جو انھوں نے اپنے گورنر کی مدح میں لکھے ہیں وہ "سعید نامہ" میں نقل کر دیئے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں۔

کہتا ہوں اتا وصف ممدوح کی | کہ ہے تس منے خاصیت نوح کی
جو ٹک اسکی بخشش کا برسے ابھال | کرے دھرت کوں بحر وکاں کی مثال

اچھے اوسکی مقدم تے گلشن منجہار — ییسر گلاں کو خزاں میں بہار
نہیں کوئی شجاعت منے اوس کا جوٹ — کریا فتح پل میں گھراں ملک و کوٹ
جو کہانیاں پچھین لحظہ اوس بیل کیاں — نہنگاں میں کھل پل تبیل کیاں
تہور ستے جب بندھا وہ کمر — کوئی موند شیراں گئے نہاٹے کر
بلاغت میں نیں اوس سر کیا دگر — اچھی تو دگر تو وہی ہے مگر
سخاوت منی ای فروغ زماں — ہوا توں جو دگر نمن زر فشاں
لکالو ہم کہن کی سکھ کی اوپر — ہو جیہ کی تول آسماں ہر سحر
سورج کا او تم ہات کا ساگر — نت آتا ہے بھکھہ کا ان گگر
دسیں سیام کیں اوس کے یوں ڈول نیں — دسی جوں چندر کے اوپر سیچ کو کہن
توں مانگ ہے اوس میں یوں جلوہ گر — کہ جوں لیک زر کی کسوٹی اوپر
ہنبھا اوسکی مکھ پو الک کی لٹک — پڑچھیا تا کیناں رشک نی سر ٹبک
قضانے بنا دو سندر دہن سجات — جو دیکھیا نزاں نور کے جل سوں بات
ہوا جسم کو انگ اوسکا چندر نچہل — نزاں ہات جہار یا سو تاری ہی گل

دو غزلیں بھی ہمدست ہوئی ہیں جو حسب ذیل ہیں :-

چاند شرماتے کیا گل کو تیرے رو کے اگل — خون ہوا ناقہ کا دل نکہت گیسو کے اگل
تیر قالب میں چلیا تیرے تجہ قد کوں بنجہا — ہو گئی حلقہ کمان جہل سوں تجہ ابرو کے اگل
دیکھ روپ رہے دوست تحیر کے منی — جب تو اے شوخ رکھی آرسی زانو کے اگل
کیا ہے جنت جو کہتے کیا ہے فردوس بریں — کیا ہے گلزار ارم جو کہتے تجہ رو کے اگل
کیا ہے وہ سرو سہی کیا ہے وہ صنوبر کی مثال — کیا جو قمرشاد کہتے قامت دلجو کے اگل
کیا ہے لالاں کی جوانی کیا ہے وہ موتیاں کی جھلک — کیا وہ شبنم جو کہتے گل کا تری خو کے اگل

کیا ہے منشی جو کہتے سحر اچھے کیا وہ طلسم ۔۔۔ ہے فسوں کیا وہ ترے طبع سخن خو کے اگل

نیں وہ مکھ جو پڑیا زلف کے بالاں تے نکل ۔۔۔ گل پڑیا باغ منی سنبل و ریحاں تے نکل
ہے لو سب بات غلط بل کہ لو بہانے کو دلاں ۔۔۔ ناگہاں چاند پڑیا ہمارا بہالاں تے نکل
خال ہے کلہ کا ترے یا ہے یو گل لالہ کا تل ۔۔۔ یا لگیا داغ میرے دل کا ہے آہاں تے نکل
ہے یو آفت کا الف، یا ہے بالا کی بل ۔۔۔ یا پڑیا مصرع موزوں کسی دیواں تے نکل
قد تیرا راست کہتے حسن کے گلزار منے ۔۔۔ .... سہی سرو کیا تازہ نہالاں تے نکل
منشی یو شعر ہے یا ہیں اچھے سحر کے یو ۔۔۔ یا کہ موتیاں تے پری چشمۂ حیواں تے نکل[۱]

افسوس ہے ان کے دکھنی قصائد ہمدست نہیں ہوئے۔

منشی کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوگا کہ مثنوی میں جو اشعار اپنے ممدوح کی تعریف میں کہے گئے ہیں وہ قصیدے کے طور پر ہیں اور ممدوح کی شجاعت، سخاوت اور قابلیت کے تذکرہ سے معمور ہیں، ان کی مثنوی ہماری نظر سے نہیں گزری یہ نایاب ہے اس لئے اس کے متعلق کوئی تفصیل نہیں لکھی جا سکتی۔

منشی کی پہلی غزل مسلسل ہے، اس میں معشوق کے حسن اور سراپا کا ذکر ہے جس انداز میں معشوق کی تعریف کی گئی ہے وہ وہی ہے جو شمالی ہند کے شعراء زمانۂ مابعد میں کرتے رہے ہیں، البتہ زبان کسی قدر بدلی ہوئی ہے۔

دوسری غزل کا موضوع بھی معشوق کی وصف نگاری ہے مگر ان غزلوں کے معائنہ سے واضح ہوگا کہ اس میں جدت خیال بھی ہے اور تخیل کی بلند پروازی بھی، یہ اپنے زمانے کے لحاظ سے صاف ہیں، ان میں سادگی ہے صفائی ہے، نازک خیالی بھی پائی جاتی ہے۔

اگرچہ ہمارے پاس منشی کے کلام کا کوئی کثیر ذخیرہ نہیں ہے، مگر جو نمونہ پیش کیا گیا ہے اس سے واضح ہے منشی اردو کے بھی بڑے اچھے اور بلند پایہ شاعر تھے۔

---

[۱] سعید نامہ

چوتھا دور

سنہ ۱۷۲۴ء تا سنہ ۱۸۰۵ء
۱۱۳۶ھ ۱۲۲۰ھ

اب دکن میں حکومت کا ایک دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ میر قمرالدین خاں آصفجاہ شمالی ہند سے آکر دکن میں آصفیہ حکومت کی بنیاد قائم کرتے ہیں اور دکن کے بہت بڑے حصے پر ان کی حکومت کا پرچم لہراتا ہے۔ تلنگانہ کے علاوہ مہاراشٹر، کرناٹک وغیرہ ممالک ان کی خود مختاری کو تسلیم کر لیتے ہیں، جب سنہ ۱۱۶۱ھ (سنہ ۱۷۴۹ء) میں آصفجاہ کا انتقال ہو گیا تو خانہ جنگی برپا ہو گئی اور پھر مرہٹوں سے مقابلے ہوتے رہے۔ یورپ کے غیر ملکی تاجر فرانسیسی اور انگریز جو صرف تجارت کی غرض سے آئے تھے اب ملک گیری کرنے لگے۔ آصف جاہ کے خاندان کی خانہ جنگی سے ان دونوں اقوام کو خوب موقع مل گئے۔ ایک عرصہ تک تو فرانسیسیوں کو عروج رہا۔ مگر اس کے بعد انگریزوں کے قدم جم گئے۔ آصف جاہ نے جو سلطنت قائم کی تھی اس کے حدود کم سے کمتر ہوتے گئے۔ ایک حصہ مرہٹوں نے لے لیا، دوسری طرف حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے تحت کرناٹک کا بڑا حصہ اور تلنگانہ کا ایک حصہ شامل ہو گیا۔ انگریزوں نے تلنگانہ کا ساحلی علاقہ "شمالی سرکار" پر اپنا عمل دخل کر لیا۔ اس طرح اس دور کا اختتام ایسے زمانہ میں ہوتا ہے جبکہ آصفجاہوں کی خود مختاری سلب ہو جاتی ہے کیوں کہ آصفجاہ اول کے چوتھے فرزند نظام علیخاں جو دوسرے آصف جاہ سے موسوم تھے۔ انگریزوں سے ایک معاہدہ کرتے ہیں جس کے

باعث آصف جاہ کی خود مختاری باقی نہیں رہی بلکہ وہ انگریز کمپنی کے زیر اثر آجاتے ہیں۔ اور اس کے بعد ہی ان کا انتقال ہو جاتا ہے اور تیسرے آصفجاہ سکندر جاہ کی حکومت شروع ہوتی ہے۔ دیوانی پر مہاراجہ چندو لال متمکن ہیں۔ اگرچہ ان کو علم و ادب اور شاعری کا شوق دامن گیر رہا مگر ان کی غلط پالیسی کی وجہ سے نظام کی حکومت پر زوال آگیا۔ نہ صرف ملک کے حدود کم ہوگئے بلکہ خود مختاری بھی سلب ہوگئی اور اب آصفی حکومت انگریز کمپنی کے زیر سیادت ایک دیسی ریاست بن گئی۔ انگریزوں کی وفاداری اور ان کی مقررہ پالیسی پر عمل ہونے لگا۔ اس تاریخی پس منظر کے تذکرہ کے بعد جب ادبی تاریخ کی طرف نظر کریں تو واضح ہوتا ہے کہ اس دور کے کئی ایک شعراء کے نام اور ان کا کلام بھی دستیاب ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو شعراء اردو زبان کی خدمت اسی طرح کرتے رہے ہیں جس طرح کہ اس زمانہ کے مسلمان شعراء انجام دیئے تھے۔ ان کے کلام میں قصیدے، مثنویاں، غزلیں، مرثیے، سب کچھ ملتے ہیں۔ اس دور کے جن شعراء سے ہم واقف ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) حقیر (۲) رنگین (۳) لالہ (۴) داغ (۵) مہتاب (۶) بے جان (۷) شفیق (۸) ذہین (۹) رائے (۱۰) ذرہ (۱۱) ہمدم (۱۲) ثابت (۱۳) مخلص (۱۴) بہادر (۱۵) تولہ (۱۶) چرن داس (۱۷) پیم چند (۱۸) خرد (۱۹) رام۔

ان شعراء کا مختصر حال اور نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) حقیر

مہا سنگھ نام، کیتا مل عرف، اور حقیر تخلص تھا۔ اورنگ آباد کے متوطن تھے فارسی میں اعلیٰ دستگاہ حاصل تھی۔ خوشنویس بھی تھے، شاعر اور نثر نگار تھے۔ مولانا آزاد بلگرامی اور شاہ سراج کی صحبت سے مستفید ہوا کرتے۔ ناصر جنگ کے دارالانشاء میں مامور تھے، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں

شعر کہا کرتے تھے۔ ۱۱۰۳ھ میں انتقال[1] ہوا۔ اورنگ آباد میں مدفون ہیں۔ افسوس ہے اردو کلام کا نمونہ ہمدست نہیں ہوا۔

(۲) رنگین لال چند نام[2]، رنگین تخلص، قوم کایستہ اور اورنگ آباد وطن تھا رنگین مزاج، لہو لعب عیش و طرب میں مشغول رہا کرتا۔ آزادانہ زندگی بسر کرتا۔ چند روز کے بعد معاش اور قوت بسری کی فکر ہوئی۔ پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ شاہ سامی اورنگ آبادی کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کیا۔ طبع موزوں تھی، اردو میں شعر گوئی شروع کی۔ شاہ سامی سے اصلاح لیا کرتا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں مشہور ہو گیا۔ ۱۱۹۵ھ میں انتقال ہوا۔

آج وہ شوخ رنگیلا جو چمن میں آوے
سرو چلنے کو لگے، غنچہ سخن میں آوے

ناصحوں کی بھی نصیحت نہیں اب اسکو قبول
بات کرتا ہے وہی اُس کے جو من میں آوے

جس کے تیں ہووے گی خواہش سخن رنگیں کی
ہند سے نہیں ہے عجب گر وہ دکن میں آوے

عشق میں کوئی نہیں آج مرے آئیں کا
کہ گرفتار ہوں میں سلسلۂ تسکیں کا

---

(۳) لالہ لالہ تخلص[3]، لالہ سرو نجی رائے نام اورنگ آباد میں رہا کرتے، شفیق سے ملاقات تھی۔ زیادہ تر فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ کبھی کبھی اردو بھی

---

[1] تذکرہ شعراء دکن۔ عبدالجبار ص ۳۵ [2] چمنستان شعراء ص ۵۱۹ [3] چمنستان شعراء ص ۲۲۳

کہا کرتے۔

"لالہ" کے داغ دل کی سیاہی کو جوش دے

تھوا پیو پیا کہ نین میں خمار ہے

اگر ٹک ناز سے ابرو چڑھا چیں بر جبیں کھینچے

مہ نو جیون کماں گوشے میں جا کر خط کتیں کھینچے

---

(۴) داغ | داغ[1] "لالہ نہال کرن"، اورنگ آباد وطن تھا، پہلے "رفعت" تخلص کرتے تھے۔ شفیق کے کہنے سے "داغ" تخلص کر لیا، شفیق سے بڑا یارانہ تھا، ان کے کلام کی شفیق نے بڑی تعریف کی ہے۔

دوڑتے دوڑتے تجھ رہ میں میرے متوالے

دانہ تاک سے پاؤں میں پڑے ہیں چھالے

انتظاری سے تری اے گل پر کیفیت

دیدۂ نرگس فتاں میں بھرے ہیں جالے

ہات مت ڈال میاں بالوں میں اپنے سر کے

ناگ بیٹھے ہیں پٹاری میں زہر کے پالے

دیکھکر "داغ" سیہ دست حنائی میں سجن

لالہ رویوں کے جہاں بیچ ہوئے دل کالے

دل آج رود سر سے پژمردہ جیون کلی ہے

شاید سجن کے سر پر دستار صندلی ہے

---

[1] چمنستان شعرا ص ۹

(۵) **جہتاب** لالہ موہن لال نام اور جہتاب تخلص تھا۔ اپنے عہد کے باکمال شاعر تھے،[1] ۱۲۰۲ھ میں انتقال ہوا۔

آب آنکھوں سے کم ہوا اردرو چشمۂ آفتاب کی سوگند
دل سے وسواس دور کر آمل تجکو تیرے جناب کی سوگند

(۶) **بے جان** لالہ جے کشن داس، اورنگ آباد وطن تھا، حضرت شاہ سراج سے تلمذ رکھتے تھے،[2] نواب صلابت جنگ (فرزند سوم آصف جاہ) کے حضور میں باریاب تھے۔

تری یاد کمر سے یوں عدم میں مل گیا "بے جان"
کہ قالب بھی نہ پاوے گر کوئی اس کا کفن کھولے

یار مہندی بھرے ہاتھوں سے اگر ہوئے طبیب
شاخ نبض دل بیمار سے مرجان ہوئے

کیوں نہ حاصل ہوے خوشی جگ میں
دلِ "بے جان" میں جان آیا ہے

باغ میں کرے نرگس، عرض حال اگر اپنا
آنکھ کی اشارت سے تب جواب دیتا ہے

---

[1] چمنستان شعراء ص ۲۰۶ و تذکرۂ شعراء دکن عبدالجبار ص ۱۰۱۷

[2] چمنستان شعراء ص ۲۶ و تذکرۂ شعراء دکن ص ۳۱۲

قید میں عاشق اگر یاد کرے گل رو کو
وہاں کے زنجیر کے دانے سے گلستاں ہووے

نگہ کی جوت بجلی کی تیں سیتی نمایاں ہے
اندھارے رات میں بجلی بھی چمکے ہے خدا حافظ

---

(۷) شفیق

لالہ[۱] لچھمی نرائن شفیق دکن کے مشہور شاعر اور مصنف ہیں انکی پیدائش ۱۱۵۷ھ میں ہوئی، ان کے والد رائے منسا رام آصفجاہ اول کے عہد میں معزز عہدے پر سرفراز تھے اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ شفیق نے رواج زمانہ کے موافق عربی اور فارسی کی تعلیم پائی ملا شیخ عبدالقادر سے جو ایک بلند پایہ عالم تھے اکتساب علم کیا تھا۔ کم عمری سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی سے شرف تلمذ رکھتے تھے۔ پہلے صاحب تخلص تھا۔ پھر شفیق قرار دیا، فارسی اور اردو دونوں میں مشق سخن کرتے تھے۔ تصنیف و تالیف کا بڑا شوق تھا۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں، چمنستان شعراء اردو شعراء[۲] کا تذکرہ ۱۱۷۵ھ میں مرتب کیا، اور گل رعنا فارسی گو شعراء کا تذکرہ ہے ان کا انتقال ۱۲۲۳ھ میں ہوا۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے

بہار آئی جنوں نے سر اٹھایا ہے خدا حافظ
نسیم صبح نے دل کو ستایا ہے خدا حافظ

تشنہ لب ہوں شراب کی سوگند
جل گیا جی کباب کی سوگند

۱؎ تذکرہ شعراء دکن عبدالجبار ص ۵۷۹ ۲؎ دکن میں اردو طبع چہارم ص ـــــ

ہر گھڑی تو قسم نہ کھا جھوٹی | تجکو دل کی کتاب کی سوگند
دل "صاحب" ہے کیا پریشاں آج | زلف کے پیچ وتاب کی سوگند

ہمیں کنج چمن میں چھوڑ کر صیاد جاتا ہے
خدا جانے کہ ہم سے خوش ہے یا ناشاد جاتا ہے

عاشقی نے کر دیا دونوں جہاں میں نامور
مر گئے ہیں ورنہ مجنوں سے یہاں لاکھوں کروڑ

قصیدے کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

یک زبردست ہے مرا والی | یک قوی دل ہے میرا پشت و پناہ
حق و باطل ہے سامنے جس کے | یوں عیاں جس طرح سفید و سیاہ
یعنے نواب میر احمد خاں | اسد الملک حضرت عالی جاہ
باپ جس کا نظام دولت و دیں | جد ہے جس کا جناب آصفجاہ

شفیق کی مثنوی کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

ارے ساقی اے روح بخش جہاں | ارے ساقی اے جان کے تن کے جاں
ترے دیکھ کر یہ تغافل کے رنگ | بھر آئی ہے چھاتی مری بے درنگ
تری گردش چشم بس ہے مجھے | یہی دور کی اب ہوس ہے مجھے
دو پیالے مجھے دے کے مت بھول جا | کہ ہوں بحرنوش اب میں فضل خدا
دے شیشے پہ شیشے گھڑے پر گھڑے | پلا اس طرح واچھڑے واچھڑے

تجھے نا کہوں تو کہوں کس سے اب　　　تجھے مجھ سے اغماض کیا ہے سبب[۱]

"آنکھوں" کے متعلق انھوں نے جو اشعار لکھے ہیں وہ بھی قابل ملاحظہ ہیں۔

نہیں یہ چشم و ابرو میں گیا بھول　　　دھرے ہیں طاق میں دو نرگسی پھول

جو راحت نیند میں پاتے ہیں وہ چشم　　　کنول کے پھول بنجاتے ہیں وہ چشم

نہ زیر ابرو ہیں آنکھیں خواب کے بیچ　　　ہرن سوتے ہیں دو محراب کے بیچ

ہوئے ہیں نشہ سے یوں چشم خونیں　　　کہ جیوں شنجرف سے بادام رنگیں

عجب ان لال ڈوروں کے ہیں انداز　　　گل و قد دس پر قدرت سے پرواز

شفیقؔ کے کلام سے نازک خیالی، بلند پروازی، سادگی کا بخوبی اظہار ہوتا ہے وہ اپنے وقت کے استاد سخن سمجھے جاتے تھے۔ قصیدہ۔ غزل اور مثنوی ان کے زور قلم کے اچھے نمونے ہیں۔ ۱۲۲۳ھ میں شفیقؔ کا انتقال ہوا۔

(۸) ذہینؔ روپ نارائن نام اور ذہینؔ تخلص تھا۔ لچھمی نارائن شفیقؔ کا حقیقی بھائی ۱۱۹۲ھ میں ولادت ہوئی، عربی فارسی اور اردو میں کافی مہارت رکھتا تھا۔ صلابت جنگ کے دربار میں باریاب تھا۔ فارسی اور اردو میں شعر موزوں کرتا۔ ۱۲۲۳ھ میں انتقال ہوا[۲] افسوس کہ کلام کا نمونہ دستیاب نہیں ہوا۔

---

[۱] ساقی نامہ　　[۲] تذکرہ شعرائے دکن۔ عبدالجبار ص۲۳۷

(۹) رائے

رائے تخلص، کنول کشن نام، کایست قوم سے تھا۔ آصفجاہ کے ساتھ دکن آیا۔ آصفجاہ ثانی کے زمانے میں معزز عہدے پر ممتاز رہا۔ تاریخ گوئی کا ملکہ حاصل تھا۔ قلعہ نلدرگ فتح ہوا تو اسکی تاریخ حسب ذیل شعر میں کہی ہے۔

آورد ہاتف مژدہ از فتح نلدرگ سرگ
دو دھ بود با ہفت و یک از ماہ شوال بزرگ
۷۵ ۱۱ ھ

سنہ ۱۲۰۰ھ میں رائے کا انتقال ہوا۔[۱] افسوس ہے کلام دستیاب نہیں ہوا۔

(۱۰) ذرہ

بالاجی ترنک نام اور ذرہ تخلص تھا۔ سنہ ۱۱۵۰ھ سے سنہ ۱۲۰۰ھ تک ان کے موجود رہنے کا پتہ چلتا ہے۔ ذرہ صاحب علم و فضل تھے۔ اورنگ آباد میں قیام تھا۔ رسا سے تلمذ رکھتے تھے۔ رسا حضرت آصف جاہ اول کے دارالانشاء میں مامور تھے۔ ذرہ کا کلیات خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا سنٹرل لائبریری حیدرآباد میں موجود ہے، ان کی غزلیں عموماً چار یا چھ شعر کی ہیں۔ طویل غزلیں صرف دو تین ہی پائی جاتی ہیں۔ کلیات میں ایک سراپا بھی ہے جس کے چودہ شعر ہیں۔ ذرہ نے دو مثنویاں بھی لکھی ہیں ایک مظہر نامہ سے موسوم ہے اور دوسری کو مثنوی لطیف کے نام سے لکھا ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

اس جان ناتواں کا مسیحا کب آئے گا
مجھے دل موسوی ید بیضا کب آئے گا

نہ بولی شمع اتنا ہائے پروانے کے ماتم پر
کہ تھا یہ ہمدم اپنا یار اپنا جاں نثار اپنا

---

[۱] تذکرۂ شعراء دکن۔ عبدالجبار ص ۴۷

پیر ہادی نے یوں کہا ذرہ — جب تلک ہے جہاں ہیں تو خوش باش

بے وفاؤں سے وفا کرتے ہیں ہم — حق محبت کا ادا کرتے ہیں ہم

قیامت رات ہے یہ رات تم بن — خوش آتا نہیں کسی کا ساتھ تم بن

کھو دیا اعتبار آنکھوں نے — دل دیا ایک یار آنکھوں نے

ایسے خوبوں کو دل نہ دے زنہار — تیرا دنیا میں کیا خدا ہی نہیں

ذرہ[1] اپنے استاد کے بیحد مداح ہیں کئی جگہ ان کی شاگردی پر فخر کیا ہے۔

کوئی دن کی فکر بیچ میں امید ہے ذرہ
از فیض رسالایق سلطان کہوں گا

فیض اقدس ہو رسا جب ذرہ ہووے آفتاب
تب لگے تجھ ہاتھ میں مضمون کے آنے کے ڈھب

ذرہ بھی اپنے رنگ میں خورشید طبع ہے
مضموں کا اس کے رنگ پڑا ہے رسا کے ہاتھ

---

[1] دیوان ذرہ

ذرہ کے مرثیہ کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

سوز جگر سے آہ کو مارے ہیں فاطمہ — سر سے ردا کو اپنے اتارے ہیں فاطمہ
بالوں سے جائے قتل سنوارے ہیں فاطمہ — میدان کربلا میں پکارے ہیں فاطمہ

دردو الم بہ جان غریبم پدید شد
فریاد اے خدا کہ حسینم شہید شد

(دیوان ذرہ)

---

(۱۱) ہمدم

رائے گلاب چند نام اور ہمدم تخلص تھا۔ نواب شمس الامرا کی سرکار میں پیشکاری کی خدمت پر مامور تھے۔ شاعری کا نہایت پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ احسن اللہ خاں بیان دہلوی سے تلمذ حاصل تھا۔ ۱۲۱۵ھ میں ان کا کلیات مرتب ہو چکا تھا جس کو ان کے فرزند چھٹو لعل زیب نے ۱۲۸۰ھ میں نواب شمس الامرا ثانی کے مطبع میں طبع کر کے شایع کیا ہے۔ ہمدم نہایت پُر گو شاعر تھے۔ جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے نمونہ کلام پیش ہے۔ ایک قصیدے کے چند شعر:—

نہیں ہے ایک طرح ہر زمانہ نیرنگ
جو دم کچھ ہے تو دم میں کچھ اور ہی رنگ

خوشی حصول ہے گا ہے گہے خفا ہے دل
کبھو فسردہ ہے خاطر کبھو ہے دل پر اُمنگ

جہاں میں سلسلہ توام ہے شادی و غم کا
ہنسے سے جو اُسے رونے میں کچھ نہیں ہے درنگ

لکھا ایسے شخص کی تعریف نام سے جس کے ...
خوشی سے غم ہو مبدل نہیں کچھ اس میں درنگ

وہ کون یعنی ثریا جناب شمس الملک
کہ شمس الامرا بہادر ہے اور تیغ جنگ
جم اقتدار سکندر حشم سلیمان فر
نظام سلطنت و زیب مسند اورنگ
ہمیشہ اس کا روشن چراغ دولت کا
عدو کو اس کے ہو جلنا نصیب مثل پتنگ

غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

آتشیں نالہ میرا ایسے جو نکلا باہر
خانۂ دل کو تمام آہ جلا ہی نکلا

چشموں کا تیرے جس کو مےخانہ نظر آیا
وہ مے سے محبت کا مستانہ نظر آیا

وصل کی شب وہ کچھ آتے ہی بگڑ جاتے ہیں
لب بھی یہاں ملنے نہیں پاتے کہ لڑ جاتے ہیں

ہمدم بنا ہے میرا دیوان ایک مرقع
جو شعر کھینچتا ہوں تصویر کھینچتا ہوں

بظاہر جاگتا تو ہوں نظر پر کچھ نہیں آتا
برنگ دیدۂ تصویر ہوں میں خواب حسرت میں

نگہ شوخ کام کرتی ہے　　　کار عاشق تمام کرتی ہے

قتل پر کس بے گنہ کے تو ہوا ہے مستعد
مت کمر سے باندھ ظالم اپنا دامن چھوڑ دے

دل سوختہ ہیں اس کی تبسم کے جو کوئی
نزدیک ان کے کچھ نہیں توقیر برق کی[1]

---

(۱۲) ثابت

از ساداتِ دکھنی حیدرآباد وطن تھا۔ ثابت تخلص کرتا تھا۔ فتوت نے[2] اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ۱۲۱۲ھ تک زندہ رہنے کا پتہ چلتا ہے کیونکہ اس سنہ میں ارسطو جاہ کی خدمت میں انکو خطاب ارسطو جاہ ملنے کی مبارک بادپیش کی ہے۔

سر گردۂ وسردار امیر دوراں　　　ہیں اعظم الامرا بہادر ذیشاں
ان کا جو خطاب ارسطو جاہ ہوا　　　ہو مبارک از فضلِ سبحاں[3]

غزل کے شعر

مجھ کو تجھ........ نے مارا　　　ہارے تری فرار نے مارا
حال کیا پوچھتا ہے اے ظالم　　　تیرے کا فرلاق نے مارا
ہمیں.... کر رہے گا اے ثابت　　　اس تری طمطراق نے مارا[4]

---

[1] دیوان ہمدم　[2] تذکرہ فتوت ص۲۲　[3] مجموعہ فصاحت
[4] تذکرہ فتوت ص۲۲۔

(۱۳) **مخلص** انندرام نام اور مخلص تخلص تھا۔ حیدرآباد کا رہنے والا تھا۔ فتوت نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر کیا ہے اور ایک شعر بھی پیش کیا ہے۔

دھوم آو نیکی کس کے گلزار میں پڑی ہے
ہات ار گلچی کا مالا نرگس لئے کھڑی ہے[۱]

---

(۱۴) **بہادر** بہادر سنگھ نام اور بہادر تخلص تھا۔ اکثر فارسی میں کلام موزوں کرتے تھے۔ کبھی کبھی اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ارسطو جاہ کی مدح میں ایک مرتبہ فارسی قطعہ بھی پیش کیا تھا۔[۲]

(۱۵) **تولا** لالہ تولہ رام المتخلص بہ تولاؔ۔ یہ بھی فارسی کے شاعر تھے۔ کبھی کبھی اردو میں بھی شاعری کی ہے۔ ارسطو جاہ کی مدح میں ان کی فارسی مبارک باد مجموعہ فصاحت میں شامل ہے۔[۳]

(۱۶) **چرنداس** ان کا بھی ایک قطعہ مجموعہ فصاحت میں شامل[۴] ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی عموماً فارسی میں شعر کہا کرتے تھے۔ ممکن ہے اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہو، کیونکہ اس زمانہ میں عام طور سے اُردو شاعری کا رواج ہو گیا تھا۔ اور شمال ہند کے کئی شعراء حیدرآباد آگئے تھے انکی وجہ سے اردو شاعری کا بول بالا تھا۔

(۱۷) **پیم چند** پیم چند نام اور اسی کو تخلص کی جگہ استعمال کرتا تھا خاندیس کا باشندہ تھا، برہان شاہ والی (قلعدار) دیوگڈہ کا متوسل رہا، اپنی مثنوی میں اسی کی مدح کرتا اور اکبر کے زمانے سے

---

[۱] تذکرہ فتوت صـ۱۸۸ [۲] [۳] [۴] مجموعہ فصاحت

اس کا خاندان دیوگڈھ کا والی ہونا بیان کرتا ہے۔

پیم چند نے فردوسی کے شاہ نامہ کو دکھنی نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ پورا ترجمہ نہیں ہے کسی قدر اختصار کو کام میں لایا ہے۔ اس ترجمہ میں اس امر کی بھی صراحت کردی ہے کہ پانچ سال کے عرصہ میں یہ ختم ہوا ہے۔ اس زمانہ میں یہ ناگپور میں تھا۔ ۱۲۰۷ھ میں اس کو تکمیل کیا ہے، کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

خدا تجکوں شاہی سزاوار ہے — صنعت کو تری کچھ نہ آکار ہے
تیرا نام روشن زباں پر دھرے — تو باہر و بہتر اُجالا کرے
جو صادق تیرے نام پر ہے مدام — تو ہے اس کنے رات دن صبح شام

سنو اے سخن سنج دانش پناہ — ذکر بادشاہ ہے کیومرث شاہ
کیا جس نے بنیاد تخت اور تاج — نہیں تو جہاں میں نہ تھا یہ رواج
رہے کوہ میں سات انبوہ کے — چرم چار پایوں کی پوشاک سے
سیامک اسم اسکو فرزند تھا — شکل خوب محبوب دل بند تھا
تھا ایک دیو دشمن کیومرث کا — اُسے ایک فرزند مکار تھا
وہ آیا کیومرث کی جنگ کو — گراں فوج دیووں کی لے سنگ کو
سیامک جو فرزند تھا بادشاہ — سو آکر مقابل ہوا با سپاہ
لڑا دیو بچہ ستے ذات سے — موا اس نکوں بختگی ہات سے

یہ کہہ کر شتابی سے ڈالا کمند — سو رستم نے سر کو بچایا زبند
بہندار خشکی سر میں آوہ طناب — سو رستم نے چاہا نکالوں شتاب
کمند پکڑ کو کیا اُینچا انے — ادھر اس نے کھینچا جو اپنے کنے

کیا زور دونوں نے ٹوٹا ادھر　　گرا زمن کا موسس ہو خوار تر
چھا پھر جو گھوڑے پلے ہوتا بلند　　سو رستم نے ڈالا گلے میں کمند

کیا ہے جو فردوسی طوس نے　　اسی عہد لگ شاہ نامہ منے
کیا اسکو ہندی زباں ہیم چند　　ہے امید جو ہووے عالم پسند

مجھے کچھ نہ لینا ہے کس کے کنے　　مگر نام باقی رہے دور منے
ہجر کی تھی بارا سے اور سات سن　　بنایا نئی داستاں جو تھی کہن

برس پانچ کر کے مشقت، تمام
شہر ناگ پور میں کیا اختتام[۱]

---

(۱۸) خرد

راجہ لکھمن لال خرد، ان کا تعلق مدراس سے تھا۔ دولت رام کے فرزند تھے۔ ۱۱۷۷ھ میں وینکٹ گیری میں تولد ہوئے۔ عربی فارسی میں تعلیم پائی۔ سن شعور پر حیدرآباد آکر شادی کی اور یہاں کے اساتذہ سے فارسی کے علاوہ علم نجوم اور ریاضی میں مہارت پیدا کی، اس کے بعد مدراس کے رئیس امیر الامراء کے حسب الطلب مدراس چلے گئے اور انکی ملازمت میں منسلک رہے رائے کا خطاب ملا، علم کا شوق تھا اس لئے مولانا عبد العلی فرنگی محلی (جو مدراس میں مقیم ہو گئے تھے) اور شرف الملک سے استفادہ کیا۔ شاعری کا شوق تھا۔ فارسی میں عموماً اور اردو میں کبھی کبھی شعر موزوں کرتے تھے۔ جامع مسجد مدراس کی تعمیری تاریخ آپ نے نکالی تھی[۲] جو آج تک مسجد پر نصب ہے۔

---

[۱] اس مثنوی کا ایک نسخہ سنٹرل لائبریری حیدرآباد میں موجود ہے (تاریخ ۱۲۰۶) [۲] عہد آصفجاہی قدیم بقلم راقم ع[۱۱۱]

(۱۹) رام

لالہ رام پرشاد نام، رآم تخلص تھا۔ کایستھ قوم کے ایک مشہور فرد تھے۔ برہان پور وطن تھا۔ عموماً فارسی میں شعر گوئی کی مشق تھی۔ اردو میں بھی طبع آزمائی کرتا۔ سنہ ۱۲۲۰ھ میں انتقال ہوا[1]۔ افسوس ہے کہ اردو کلام کا نمونہ ہمدست نہیں ہوا۔

اس دور کے شعراء کو متعارف کر دیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ انھوں نے غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی، مرثیہ، وغیرہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلام میں سادگی، صفائی، پاکیزگی اور ندرت کے اچھے نمونے موجود ہیں۔

دکن میں اردو شاعری کے پروان چڑھانے میں ان شعراء نے اپنے ساتھیوں کا ہاتھ بٹایا ہے۔ اس وقت کے رواج کے مطابق حسن و عشق یا تغزل کے میدان میں اچھے اچھے پھول کھلائے ہیں۔ تصوف کو بھی اپنے کلام کا جولان گاہ بنایا ہے اس طرح عشق مجازی کے ساتھ عشق حقیقی کی ترجمانی کی ہے

چونکہ اس زمانے میں مثنوی کا رواج کم ہو چلا تھا اس لئے ہندو شعراء نے بھی اپنے ماحول کا ساتھ دیا ہے۔ تاہم مثنوی کو بالکل نظر انداز نہیں کیا گیا اس صنعت میں بھی اونھوں نے اردو شاعری کی خدمت کی ہے۔ قصیدہ کا میدان بھی ان سے خالی نہیں رہا۔ ان کے قصیدوں میں قصیدہ کے تمام لوازم ملتے ہیں۔ مرثیہ نگاری میں بھی اپنے نمایاں نقش چھوڑے ہیں۔

بہر حال اس دور کے شعراء نے اردو شاعری کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ اور ان کے نام کو آج تک دنیائے شاعری نے زندہ رکھا ہے۔

---

[1] تذکرہ شعراء دکن۔ عبد الجبار صفحہ ۴۸۰

پانچواں دور

سنہ ۱۸۰۵ء تا سنہ ۱۸۸۳ء
۱۲۲۰ھ ۱۳۰۰ھ

اس دور میں دکن کے بڑے حصے پر انگریزوں کی حکومت قائم ہوگئی
مہاراشٹر سے مرہٹوں کی خود مختاری ختم ہوگئی، کرناٹک سے حیدر علی اور ٹیپو سلطان اور بدر اس سے محمد علی خاں والاجاہ کی حکومتوں کا خاتمہ ہوگیا۔
آصفی خاندان کے تیسرے، چوتھے اور پانچواں حکمران اللہ کو پیارے ہوگئے اور چھٹے حکمران اول تو کم سنی کے باعث ایک ایجنسی کے تحت کچھ اختیارات کے ساتھ مسند آصفیہ پر بٹھائے گئے مگر پوری طرح انگریزوں کا عمل دخل رہا۔ انتظامی معاملات میں بھی نظام کو رزیڈنسی کے احکام کی تعمیل کرنی پڑتی تھی۔
اسی دور میں ہندوستان کی آزادی کا وہ معرکہ ہوا جسکو انگریزوں نے سنہ ۱۸۵۷ء کے غدر سے موسوم کیا تھا۔ اسی جنگ آزادی میں حکومت آصفیہ کے باشندوں نے جو حصہ لیا تھا اب وہ عوام کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ تاریخ آزادی ہند کی کمیٹی نے اب تک تین جلدوں میں اس کو شایع کر کے ثابت کر دیا ہے کہ آصفی قلمرو کے عوام نے بھی آزادی کی جدوجہد میں پورا حصہ لیا تھا۔
اس دور کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں

حیدرآباد میں اہل دہلی اور لکھنو کی آمد شروع ہو گئی تھی، احسن اللہ خاں بیان، مشتاق، حفیظ، نصیر وغیرہ حیدرآباد آ گئے تھے، اس لئے اب دکن کی شاعری پر لکھنو اور دہلی کا رنگ آ گیا۔ مدراس میں محمود بلگرامی، تجمل لکھنوی وغیرہ نے نام آوری حاصل کی اس دور کے متعدد شعراء مشہور ہیں اور سب سے بڑے شاعر مہاراجہ چندولال شاداں ہیں۔

(۱) شاداں راجہ چندولال، شاداں تخلص، ۱۱۸۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۶۱ھ میں اس دار فانی سے کوچ فرمایا۔ سلطنت آصفیہ کے پیشکار تھے اور مدت تک دیوانی کے اہم فرائض بھی انجام دیتے رہے، بڑے مخیر تھے، عام طور سے آپ کی جود و سخا اور داد و دہش کا شہرہ تھا۔ شعر و سخن سے بڑی دلچسپی تھی۔ آپ کے دربار میں ہمیشہ شعرائے نامور جمع رہا کرتے تھے۔ شاداں کے دو دیوان مرتب ہوئے ہیں۔[1]

مہاراجہ چندولال کا کلام سنجیدہ، شگفتہ اور پسندیدہ مضامین کا ذخیرہ ہے کلام کی رنگینی، انداز بیان کی جدت اور تخیل کی بلندی آپ کی قادر الکلامی کی شاہد ہیں۔ آپ کے کلام کا بڑا حصہ تصوف اور معرفت سے مملو ہے۔

نور تھا یا شعلہ تھا یا برق یا خورشید تھا
کچھ تو اے موسیٰ کہو کیا تھا وہ جلوہ طور کا

موحد ہے تو یکتائی سے مت ٹل — نہ کہہ اپنی زباں سے دوسرا ہے
ہمیں کیا کام ہے دونوں جہاں سے — ترا ملنا ہمارا مدعا ہے

خورشید میں ہے نور تری مہر و عطا سے — یہ وجہ ہے ہر ذرہ جو خورشید سے چمکا

---

[1] تذکرہ محبوب الزمن شعرائے دکن۔

ہے کام یہاں عاشق صادق کا ورنہ اُٹھتا ہے کسی سے یہ بھلا بارِ محبت

جامۂ یار کو کیا جامۂ گل سمجھا ہے خار کی طرح سے دامن دلدار نہ کھینچ

تو ہی غفار ہے مجرم ہوں تیرا خطا کیوں کر نہ ہو آخر بشر ہوں

پردۂ چشم اُٹھا دیدۂ تحقیق سے دیکھ جب یگانہ وہ ہوا، کوئی نہیں بیگانہ

شاداںؔ کے کلام میں تغزل کے ساتھ ساتھ تصوف اور پند و موعظمت بھی موجود ہے۔

نہ بھٹکے گا نہ بھولے گا وہ راستہ براہ راست جو کوئی چلے گا

مُرغ بے ہنگام کو کرتے ہیں دور بات ہوتی ہے بھلی ہنگام پُر

جوہری کے سامنے جوہر کھلے تو قدر ہے
راز دل اُن سے نہ کہہ تو جنکے سینے تنگ ہیں

لالچ ہے بُری چیز خبردار ہو شاداںؔ
جان اپنی گنواتی ہے مگس میٹھے کی لالچ

ماہی ہو اگر گندی تو پانی کرے گندہ مجلس میں نہ رکھے اُسے جو ہووے شرر ناک

دینے والے کو بجز داد و دہش کب چین ہے
خوش بہت ہوتا ہے جس دم اسکو سائل مل گئے

کیا کہئے رات کیسی کٹی اس کے پیار میں
کس کس مزے کے لطف تھے بوس و کنار میں

سو سو طرح سے لیتے تھے بستر پہ کروٹیں
گذری تمام رات ترے انتظار میں

بوسے لینے ہی سے پژمردہ ہوئے جاتے ہیں
رشک گل اتنی بھی نازک بدنی خوب نہیں

جز تمہارے نہیں مقصد کچھ اور
تم سے جو مانگتے ہیں سو دیجئے

جو مانگ سر پر ترے میری جان نکل آئی
اسی کے دیکھنے کو کہکشاں نکل آئی

یہ ماہ جبیں گرمی صحبت نہیں سہتے
شبنم کی طرح ٹپکے ہے پوشاک سے پانی

اب شکل دکھا کر حجاب مت کر
سو جان سے ترے نثار ہیں ہم[۱]

---

[۱] دیوان شاداں

مرثیہ کے تین شعر ملاحظہ ہوں۔

دربار شام میں جب قیدیوں کو شام ہوئی
وہ رات بیٹھے روتے میں تمام ہوئی
ہوئی جو صبح کمر بستہ فوج شام ہوئی
ہوا یزید برآمد یہ دھوم دھام ہوئی
فلک ستائے مصیبت کی مبتلا زینب
چلی یزید کی مجلس میں لے ردا زینب

---

(۲) اصغر سوامی پرشاد المتخلص بہ اصغرؔ، کایستھ قوم کے فرد تھے۔ باپ کا نام رام پرشاد اور راجہ کا خطاب ملا تھا۔ محلہ حسینی علم میں سکونت تھی۔ اصغرؔ کو نواب بدر الدین خاں امیر الدولہ المتخلص بہ لائقؔ سے شرف تلمذ تھا۔ لائقؔ آصف جاہ ثالث کے میر ساماں تھے اور اصغر ان کے سررشتہ میں مامور تھے، اصغرؔ فارسی، اردو اور ہندی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، فارسی اور اردو غزلیات کا ایک مختصر مجموعہ مرتب کیا تھا جو کتب خانہ آصفیہ[۱] میں موجود ہے یہ مجموعہ ۱۲۲۹ھ میں مرتب ہوا ہے۔ اصغرؔ کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

پایا نہ کبھی یہ دلِ دیوانہ کسو نے
حسرت میں کوئی رہ گیا ویرانہ کسو نے
کہتے ہیں کوئی دور ہے نزدیک ولیکن
ٹک چھوڑ خودی عشق کو جانا نہ کسو نے
سب آکے مسافر گئے اس فانی سرا سے
اس جائے میں ہرگز نہ کیا ٹھکانہ کسو نے
کونین سے دھو ہاتھ چکا ہوئے اصغر
بولا جو ہو مضمون یہ مستانہ کسو نے

---

[۱] دواوین (۵۰۱)

درد دل جیسے کہیں اپنا ہم سنتے سنتے — سنتے ہی جاتے دیوانہ پھرے رستے رستے
عشق کے رمز کو پانا ہے بہوت امر محال — لاکھوں ناسور ہوئے خار ونکے دھستے دھستے
اصغرا بشاد ہے نت فضل سے رب کے ہردم — ہر نگہ میں کھلے گل جملوں کے دستے دستے

یہ دل جب آ کر محبت میں بافراغ لگا — یقیں وہ ہوش سے غفلت کو تب چراغ لگا
حقیر اصغر ناداں فقیر ہو دل سے — وہ بوئے گل سے عجیب دمبدم دماغ لگا

---

(۳) عاجزؔ

نول سنگھ نام عاجزؔ تخلص تھا۔ راجہ بھوانی پرشاد کے سر رشتہ میں ملازم تھے۔ راجہ چندو لال کے دربار میں رسائی حاصل تھی مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ شاعری کا اچھا مذاق رکھتے تھے۔

عاجزؔ نے اپنے کمال فن کا اظہار ایک مثنوی کے ذریعے کیا ہے "جگت دیپ" اس کا نام ہے اور سنہ ۱۲۴۲ھ میں مرتب ہوئی ہے۔ مثنوی میں ایک دلچسپ قصہ منظوم کیا گیا ہے۔ مثنوی میں اول حسب قاعدہ حمد ہے اس کے بعد نعت۔ پھر اپنے مرشد "مہاپرس" کی مدح اور ستایش کی ہے۔ اس کے بعد بادشاہ وقت سکندر جاہ آصف جاہ ثالث کی مدح ہے۔ بادشاہ کی تعریف کے بعد وہ مہاراجہ چندو لال اور ان کے بعد اپنے مربی اور افسر راجہ بھوانی پرشاد کی مدح کا عنوان رکھا ہے ان تمہیدی امور کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے اس کے تقریباً دو ہزار شعر ہیں۔

عاجزؔ کے سنہ تولد اور مرنے کے سنہ کی کوئی تحقیق نہ ہو سکی، کیونکہ کسی تذکرہ میں ان کا ذکر نہیں ہے۔

کلام کا نمونہ پیش ہے۔

ترا نام گویندہ ہوں کردگار — جہاں آفریں ہے تو پروردگار
خداوند ہے تو جہاں گرکار — کرشمہ ترا آشکار آشکار

گنہ گار عاصی ہوں بدکار ہوں — ترے در پہ آیا ہوں سرنگوں
عنایت سے اپنے خدا کے رسول — نہ کر مجھ کو دنیا میں ہرگز ملول

رہے دونوں سوتے ہوئے نیم شب — جگت روپ جاگا مگر تشنہ لب
جگایا نہ اوس دوسرے یار کو — کہا دل سے اب تو جو کچھ ہو سو ہو
نکل باہر اور پیجیئے تو خوب آب — اب تشنگی سے نہیں مجھ کو تاب
نہ فرخ کو اب ہے جگانا صلاح — نہ پانی ہی اس سے لگانا صلاح
یہ کہتے ہی اور گھر کے انگن میں آ — یہ چاہا کہ پانی پیئے اب ذرا
کہ اک بار اس کی طالب جو تھی — پے مغلوب تھا اور دو غالب جو تھی
فلک سے اوتر آئی وہ اک بار — کیا تخت پر اوسکو اپنے سوار
سوار اوسکو کر کے اُڑایا وہ تخت — اوسے کچھ نہ بولا وہ شوریدہ بخت

پگھل کر جگت روپ پانی ہوا — وہی جشن و عشرت کا بانی ہوا
گئے دیکھتے ہی سب آپس میں مل — نظر سے نظر جی سے جی دل سے دل
لبوں سے ملے لب دہن سے دہن — دلوں سے ملے دل بدن سے بدن
ملی آنکھ سے آنکھ خوش حال ہو — گئی حسرتیں دل کی پامال ہو
ملی جا کے چھاتی جو چھاتی کے ساتھ — چلی ناز و غمزہ کی آپس میں بات

.. .. — .. ..

اوہی صبح کو دو لو گلفام دو　　　گئے باری باری سے حمام دو
نہ پوچھ اونکے حمام کا مجھ سے روپ　　　کہ جوں ہووے باریک بدلی کی دھوپ
جو دونوں خوشی سے نہانے لگے　　　تو غم کھانے اونکے ٹھکانے لگے

لکھوں کیونکر میں اوس سبھا کا سماں　　　کہ قاصر ہے یہاں سو قلم کی زباں
سنگھاسن پے اندر کا آ بیٹھنا　　　رفیقوں کا پھر گرد جا بیٹھنا
بہم دیوتا اوس کا ہوتادو جمع　　　کہ جوں جمع پروانہ ہوں گرد شمع
برابر برابر قرینے سے سب　　　بہم ملکے بیٹھے بہ عیش و طرب
ہر اک دیوتا گرچہ یک شاہ تھا　　　پر اندر ستاروں میں جوں ماہ تھا
ہر اک کو کہ رکھتا تھا جاہ و جلال　　　پر اندر کا سب سے بڑا تھا کمال؎

---

(۴) مست

رتن لال نام اور مست تخلص تھا اور ان کا خاندان شمالی ہند سے آکر ارکاٹ میں مقیم ہوا۔ رتن لال کے دادا تیج رائے جو قوم کایستھ سے تھے اپنے کم عمر فرزند چنا لال کو چھوڑ کر انتقال کر گئے حیدر علی اور نظام کی جنگ کے بعد چنا لال حیدرآباد آکر بس گئے۔ چنا لال اولاً راجہ تیج ونت کے متوسل رہے۔ دربار نظام سے رائے کا خطاب ملا جب تیج ونت پر زوال آگیا تو راجہ چندو لال کے متوسل ہو گئے۔

رتن لال کی ولادت حیدرآباد میں ہوئی۔ ہنوز چودہ پندرہ سال کے تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ اسی وجہ سے سرکاری معاش موقوف ہو گئی البتہ ذاتی منصب جاری ہوئی۔ بچپن سے رتن لال کو علم سے دلچسپی رہی اور اسی

؎ مثنوی اردو ۲۹۱ کتب خانہ آصفیہ۔

شغف کے مدنظر اس زمانے کے مشہور صاحب فن، ماہر علم و ہنر شمس الدین فیض کے شاگرد بنے اور شاعری میں بھی ان سے تلمذ رہا۔

تحصیل علم کے بعد پائیگاہ شمس الامرا میں ملازم ہوئے اور فرید الدین فاؔئق کے توسط سے شمس الامرا کے دربار میں باریاب ہوئے۔ موصوف کے دارالترجمہ میں ملازم ہو کر کئی کتابوں کا ترجمہ کیا "عمدۃ التواریخ" کی تصنیف فرمائی سنہ ۱۲۶۸ ہجری میں ان کی عمر ۴۶ سال کی تھی اس لحاظ سے سنہ ۱۲۲۲ھ انکی ولادت کا سنہ قرار پاتا ہے۔ افسوس ہے کہ مرنے کے سنہ کی تحقیق نہ ہو سکی۔ کلام کا نمونہ بھی نہ مل سکا۔

---

(۵) زیبؔ

رائے چنولال نام اور زیبؔ تخلص کرتے تھے ان کے والد گلاب چند ہمدم کا تذکرہ اوراق گزشتہ میں ہو چکا ہے۔ زیبؔ اپنے وقت کے اچھے شاعر تھے، باپ سے تلمذ تھا، اپنے باپ کے کلیات کو سنہ ۱۲۸۰ ہجری میں طبع کر کے شایع کیا۔

زیبؔ کی ولادت اور انتقال کے سنہ سے ہم واقف نہیں ہیں ان کا دیوان سنہ ۱۳۰۰ھ میں مطبع ہزار داستان حیدرآباد سے شایع ہوا ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے

مقدور نہیں حمد الہی کے بیاں کا　　ہر موے بدن سے بھی جو لوں کام زباں کا

خوش قبا اپنا جو گلشن میں خراماں ہو گیا
مارے حسرت کے گلوں کا چاک داماں ہو گیا

مثل یوسف قید ہے چاہ زنخ میں دل میرا
یار کا چاہ زنخداں چاہ کنعاں ہو گیا

کوڑیوں کے مول کیا اب مفت بھی بکتا نہیں
کیا متاع دل کا نرخ اے زیبؔ ارزاں ہو گیا

بامروت کوئی حسیں نہیں ہوتا　　جس کو دیکھا سو بے وفا دیکھا
دل پہ اس شوخ کے اثر نہ ہوا　　زیبؔ نے حال دل سنا دیکھا

نجد سے جب چلی لیلےٰ　　قیس کا پھر کہاں ٹھکانہ تھا

دیر و حرم میں کیا ہے بغور اپنے دل میں دیکھ
کیوں ڈھونڈتا ہے یار کو تو جا بجا عبث

وہ آئیں یا نہ آئیں یہاں دم پہ ہے بنی
ہم سے نہ ہوگی طے یہ راہِ انتظار حیف

یار مجھ سے ہم بغل ہو ایک شب　　دیدہ و دل اپنا تم عادی کرو

سوال وصل پہ ہر روز کا جواب ہے کل
بھلا یہ کہہ کہ کچھ اس کل کی انتہا بھی ہے

عشق کی راہ ہے دم شمشیر　　زیبؔ جانا کمال مشکل ہے

---

(۶) رسؔا انت رام نام اور رساؔ تخلص تھا، حیدرآباد کے مشہور جاگیردار مہپت رام کے اولاد سے تھے۔ راجہ مہپتؔ رام کا نام تاریخ دکن میں مشہور ہے۔ وہ انگریزوں کے خلاف فرانسیسیوں کے

دوست تھے اس لئے انگریزوں نے حیدرآباد کے دیوان میر عالم کے اتفاق سے ان کو حیدرآباد سے نکالدیا تھا، مگر میر عالم کے بعد ان کا خاندان پھر حیدرآباد میں آکر بس گیا۔ افسوس ہے کہ رسؔا کے متعلق تفصیلی حالات بہم نہ ہو سکے البتہ ان کا قلمی دیوان ان کے خاندان میں موجود ہے نمونہ کلام اسی دیوان سے حاصل کیا گیا ہے۔

زیب عنواں جب وصف روئے جاناں ہو گیا
ہر ورق دیوان کا میرے گلستاں ہو گیا

شب کو تھا وہ مہر طلعت جلوہ گر بالائے بام
منزل ماہ میں گذار مہر درخشاں ہو گیا

جسم خاکی عاشق چشم صنم کا بعد مرگ
خاک ہو کر سرمۂ چشم غزالاں ہو گیا

قطرہ قطرہ سیل ہو جاتا ہے شور آب جگر
اشک کی موجوں سی بحر دل میں طوفاں ہو گیا

کچھ نہیں میرے مکاں میں روشنی کی احتیاج
دل میرا داغوں سے رشک ماہ تاباں ہو گیا

اس مسیحا نے جو دیکھا لطف سے میری طرف
رنج راحت ہو گیا اور درد درماں ہو گیا

دست وحشت کی زبردستی کیوں کیا اے رسؔا
ٹکڑے دامن ہو گیا پرزے گریباں ہو گیا

آہ کے ساتھ جان سے گزرا   دیکھو عاشق نے کیا کمال کیا

آج ملک بقا کو جانے کو　　تنگ ہم نے فنا کا حال کیا
اے رساؔ دے کے دل کو تو نے عبث
کچھ نہ اندیشۂ مآل کیا

ذبح کرنا ہے تو جلدی ذبح کر　　دیر کیوں کرتا ہے اے جلاد حبیب

خنجر ناز سے سر کاٹ کے گردن سے　　دوش کو میرے سبکبار کیا کیا تدبیر

شیشۂ دل کو نہ توڑ اے سنگدل　　توڑ کر تجھکو بنانا آتا نہیں

نہ توڑو سنگ سے دل کو رساؔ کے　　کہ اس شیشے میں پریوں کا مکاں ہے

باغ سے آتی ہے غنچوں کے چٹخنے کی صدا
گل کو معلوم نہیں کس کی طلب گاری ہے

---

(۷) ربطؔ بالا پرشاد نام اور ربطؔ تخلص تھا۔ اگرچہ پیدائش لکھنو کی تھی مگر پرورش حیدرآباد میں ہوئی، راجہ خوش حال چند کی دختر سے بیاہ کیا اور راجہ خوش حال چند کی وفات کے بعد انکی خدمت اور جاگیرات سے سرفراز ہوئے، شاعری کا بڑا شوق تھا، عام طور سے اس وقت کی محفلوں میں آپ کی غزلیں گائی جاتی تھیں۔
کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

تصویر اگر شمع رسالت کی لکھوں میں
خامے سے نکل جلوۂ شق القمر آوے

تاب و تواں و صبر گئے دل کے ساتھ ساتھ
محفل اُٹھی ہے صاحب محفل کے ساتھ ساتھ
سر سے کفن لپیٹے ہوئے پھر رہے ہیں "ربط"
مرنے کے اشتیاق میں قاتل کے ساتھ ساتھ

یوں تو یوں ہی صحیح، منکر ہیں مرے قتل سے آپ
سرخیٔ پنجۂ نازک کو حنا کہتے ہیں
وہ جو خنجر مرے مژگاں کی طرح ہے پُر خوں
یہ جو دامن پہ ہیں چھینٹے اسے کیا کہتے ہیں[1]

---

(۸) مکھن

راجہ مکھن لال نام اور مکھن تخلص، مہاراجہ چندو لال کی جانب سے حضور میں عرض بیگی تھے۔ اس خدمت کی وجہ سے راجہ کے خطاب سے بھی سرفراز ہوئے۔ سنہ ۱۲۶۰ھ میں رباعیات عمر خیام کا ترجمہ اردو میں کیا تھا، اول تو ترجمہ ہی دشوار ہے، پھر رباعی ہی میں اس کو ادا کرنا، قادر الکلامی پر شاہد ہے۔ چند رباعیاں پیش کیجاتی ہیں۔ آپ کا قلمی دیوان کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے[2]۔ دیوان صرف نعت رسول مقبول صلعم اور مدح حضرت غوث اعظم رضؓ پر مشتمل ہے جس سے آپ کی دلی محبت کا اظہار

۱؎ گلزار آصفیہ صفحہ ۴۵۲ ۲؎ دیوان اردو ہے۔

ہوتا ہے جو آپ کو ان سے تھی۔

جب عشق ہو پستی و بلندی پھر کیا — ہے بے خودی تو ہوش مندی پھر کیا
رکھ طاق میں یار تو مریدی پیری — رندی میں خیال ارجمندی پھر کیا

گزری ہو کبھی بہ لطف ساقی یہ عمر — صحبت میں بتوں کے بے نقابی یہ عمر
واللہ نہ پھر رہے گی حسرت دلمیں — کاٹیں گے بہ عیش و لطف باقی یہ عمر

پہلے غم ہجر گرمی محفل تھا — چندے برکات شوق ہم منزل تھا
اے یار اب آکے دیکھ تربت کو مری — یہ مشتِ غبار کچھ دنوں دل تھا[۱]

محمدؐ نبی ہیں وہ عالی جناب — ہوا جن سے شق ماہ نوری نصاب
کیا جن سے آہو سوال و جواب — پھرا جن کے فرمان سے آفتاب

جہاں بیچ جب تک کہ جیتے رہو
نبی جی نبی جی نبی جی کہو

نبی کے ہے ذاکر زبان حجر — نبی کو کئے سجدہ آکر شجر
نبی کو کیا حق نے خیر بشر — نبی سا بنا کون ہے نامور

جہاں بیچ جب تک کہ جیتے رہو
نبی جی نبی جی نبی جی کہو

طویل مسدس ہے۔

حضرت محی الدین غوث اعظمؓ کی مدح میں کئی قصیدے اور مسدس وغیرہ

---

[۱] رباعیات مکمل

ہیں ایک قصیدے کے چند شعر۔

یا محی الدین تم ہو دو جہاں کے بادشاہ
ہے تمھاری سلطنت پر ماہ اور ماہی گواہ
نورِ چشمِ مصطفےٰ ہو بے شک و بے اشتباہ
حال میرے پر کرو تم لطف رحمت سے نگاہ
یا قطب یا غوث الاعظم یا ولی دین پناہ
قرضداری سے چھڑاؤ مجکو از بہر الٰہ

---

(۸) ہوش

روپ نارائن نام اور ہوش تخلص تھا۔ اسی دور کے ایک صاحب فن شاعر تھے، غزل، قصائد وغیرہ میں اظہار خیال کرتے تھے۔ مہاراجہ چندو لال کے دربار سے تعلق تھا۔ تفصیلی حالات گوشۂ گمنامی میں ہیں۔ ایک قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جو بکن گل کی بی چمن بہ چمن	تو بہاری نبی کے جیون مالن
قطع کرنے گلوں کی پیراہن	بوستان نسیم ہے درزن
ریش کو رنگ دے شفق سے فلک	اب جواں ہو بناتی ہے جوبن
بی فلک نے ستاروں کا مالا	روز شب پیرہن میں ہے سمرن
اس زمانہ میں ہے دھرم اوتار	ماہ راجہ تو راجہ راج کرن
وان کے وقت یوں ہے روپ سرا	گویا اوتریں بن کے آپ نارائن
آرزو کچھ نہ رہے نہ پرا اس کو	ہوے ہے جس کے تیں تیری درشن
یہ سخاوت کا شور ہے تیرا	حالم آتا ہے چھوڑ چھوڑ وطن

لہ دیوان مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ۔

ہوش کی یہ دعا ہے اب شب و روز — رہے محکوم تیرا چرخ کہن
دوست شاداں رہیں سبھی تیرے — ہوویں پامال تیرے سب دشمن

---

(۹) ناتک رائے خوب چند المتخلص بہ ناتکؔ، کایستھ قوم سے تعلق رکھتے تھے مہاراجہ چندو لال کے متوسل تھے۔ قصائد و غزلیات کیا اچھا ملکہ حاصل تھا۔ ایک قصیدے کے چند شعر پیش ہیں۔

مچی ہے دھوم ہولی کی جہاں میں آج خوب ہے
صدائے ساز سارنگی دف خوش راگ عشرت ہے

ہے چاروں طرف سے باہم تراتر قمقمہ بھاری
کوئی گل چہرہ خنداں ہے کوئی ہے تصویر حیرت ہے

مبارک باد ہولی اپچھرا اندر کی گاتی ہیں
گلال ابرک عبیر عنبر سے تہکاروں کی کثرت ہے

دکن میں خوش رہے ناتک ہمیشہ راجہ چندو لال
کہ صاحبزادہ بالا بخت اور تاج دولت ہے

---

(۱۰) منشی رائے جین رائے نام اور منشیؔ تخلص کرتے تھے، مہاراجہ چندو لال کے متوسل تھے۔ ایک قصیدے کے چند شعر درج ہیں۔

ماہ سے ماہی تلک تیرے کرم کی دھوم ہے
یہ تعجب ہے کہ بندہ ایک کیوں محروم ہے

دن کو تو ماہ درخشاں شب کو ماہ بزم ہے
دھرم تیرا تا بہ ہند و ملک شام و روم ہے

تا ابد رہے سلامت وہ اور اس کا نور چشم
با خوشی یارب کہ عالم جس کا اب محکوم ہے
جب تک دنیا ہو چندو لال ہو فیاض عصر
جس کے دست جود سے ہر ایک کا مقسوم ہے
عوض جاگیر مراد در ا با می کا کام
لطف کے آگے نہیں کچھ قدر یہ معلوم ہے

---

(۱۱) کیول کشن [۱] کیول کشن نام اور کشن تخلص مہاراجہ چندو لال کے مصاحبوں میں شامل تھے۔ عموماً فارسی میں کلام موزوں کرتے تھے۔ کبھی کبھی اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

(۱۲) مکند [۲] بال مکند نام اور مکند تخلص تھا۔ زیادہ تر فارسی شاعری کرتے تھے۔ مہاراجہ چندو لال کی مدح میں قصائد اور قطعات موزوں کئے ہیں۔ اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

(۱۳) روشن [۳] روشن چند نام اور روشن تخلص۔ مہاراجہ چندو لال کے مصاحب تھے، فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کرتے تھے۔

(۱۴) رائے [۴] مہتاب رائے نام اور رائے تخلص تھا۔ مہاراجہ چندو لال کے دربار میں باریاب تھے زیادہ تر فارسی شاعری کرتے تھے۔

(۱۵) جگناتھ [۵] جگناتھ نام اور تخلص تھا۔ مہاراجہ چندو لال کے دربار میں رسوخ تھا۔ فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کرتے تھے۔

---

[۱] [۲] [۳] [۴] [۵] بیاض مدح چندو لال۔

(۱۶) عاشق [۱] بنکٹ پرشاد نام اور عاشق تخلص تھا۔ بودھن وطن تھا یہاں کے مشہور شاعر قاضی محسن کے شاگرد تھے۔

تبصرہ اس دور کے شعرا کے کلام سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انکی شاعری میں دہلی اسکول اور لکھنو اسکول کا اثر موجود ہے۔ مثنوی کی صنف کو تقریباً ترک کردیا گیا۔ غزل گوئی اور قصیدہ نویسی شباب پہ رہی، تغزل کے ساتھ تصوف بھی انکے کلام کا موضوع رہا۔ مہاراجہ چندولال کی قدردانی کی وجہ سے زیادہ شعرا ان کے متوسل تھے اور قصیدہ گوئی کو بھی ترقی ہوتی رہی۔ راجہ مکھن لال نے رباعی کو ترقی دینے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ مرثیہ نویسی بھی ہوتی رہی۔

اسطرح اس دور کے شعراء اپنے ماقبل زمانہ کے مطابق اردو زبان کی خدمت انجام دینے میں حصہ لیا ہے، دہلی اور لکھنو اسکول کے شعراء جمع ہونے سے ایک جدید اسکول کا آغاز ہوا جس میں دونوں جگہ کے خصوصیات نظر آتے ہیں۔ حضرت فیض کے شاگردوں نے اس دور میں اردو شعرگوئی میں بڑا حصہ لیا ہے۔ ان کے کئی شاگردوں کا تذکرہ صفحات آیندہ میں درج ہے۔

---

[۱] عہد آصفی کی قدیم تعلیم

چھٹا دور

سنہ ۱۸۸۳ء / ۱۳۰۰ھ تا سنہ ۱۹۱۸ء / ۱۳۳۶ھ

جیسا کہ اوراق گذشتہ میں صراحت کردی گئی ہے کہ چھٹا دور سنہ ۱۸۸۳ء ۱۳۰۰ھ سے شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سنہ میں حکومت آصفیہ کی سرکاری زبان اُردو قرار دی گئی۔ تمام دفاتر میں اردو رائج ہوگئی۔ مدارس میں اردو تعلیم ہونے لگی۔ اور ساتواں دور سنہ ۱۹۱۸ء ۱۳۳۶ھ سے شروع ہوتا ہے جبکہ جامعہ عثمانیہ کا منشور خسروی (رائل چارٹر) جاری ہوا۔

چھٹے دور میں دہلی اور لکھنو کے زیادہ شعراء دکن آئے۔ خصوصاً داغؔ، امیرؔ، ظہیرؔ، سرشار، حبیبؔ کنتوری، ترکی، گرامی، نظم طباطبائی وغیرہ کی وجہ سے دکن کی اردو شاعری میں ایک برقی لہر دوڑ گئی۔ اسی زمانہ میں منشی (سورج بھان) میکشؔ حیدرآباد آئے اور اسلام قبول کرلیا۔ مرید ہوکر معرفت کے مراتب طے کرنے لگے۔ فیضؔ کے شاگرد ہر سال فیضؔ کے عرس کے موقع پر مشاعرہ منعقد کرتے اور کلام کا مجموعہ گلدستۂ فیض کے نام سے شایع کرتے تھے۔

حضور نظام میر محبوب علی خاں کو شاعری کا شوق دامن گیر ہوا۔ داغؔ کے شاگرد بنے اور اپنے استاد کو خوب نواز کر مالا مال کردیا۔ اِس طرح مہاراجہ

کشن پرشاد کو ان کے نانا چندو لال کے ورثہ میں شاعری سے بڑی دلچسپی رہی
ان وجوہات سے اس زمانہ میں شاعری کا بول بالا رہا۔ غزل کی دُنیا آباد ہوئی
ہر بزم طرب و نشاط میں داغ اور امیر مینائی کی غزلیں محفل کو گرماتی رہی۔
مشاعروں میں داغ کے شاگرد فیض کے تلامذہ اور ان کے سلسلہ کے شعراء کا
کلام مشاعروں کی زینت بنتا رہا۔

اس زمانہ میں کئی ہندو شعراء نے نام آوری حاصل کی۔ خصوصاً شاد مہاراجہ
کشن پرشاد، راجہ گردھاری پرشاد باقی نے بڑی نام آوری حاصل کی۔ فیض کے
مرید اور شاگرد رمز نے اپنے حالت جذب میں دنیائے شاعری میں سدا بہار
پھول کھلائے۔ غرضیکہ اس دور کے ہندو شعراء خصوصیت سے قابل ذکر
اور لائق ستائش ہیں۔ اب ہم شعراء کو متعارف کراتے ہیں۔

(۱) رمز بہاری لال المتخلص بہ رمز۔ ان کے دادا دہلی سے حیدرآباد
آئے تھے، اس زمانے میں رمز کے والد صغیر سن تھے۔ ان کو
حضرت فیض حیدرآبادی کی ہم درسی کا شرف حاصل تھا۔ رمز کی پیدائش حیدرآباد
میں ہوئی اور فیض کی صحبت اور تربیت سے فیضیاب ہوئے اور انہی سے
تلمذ بھی حاصل تھا۔ رمز نے اپنے حالات زندگی خود اپنے قلم سے لکھے ہیں یہ حالات
اُس زمانے کے رواج کے مطابق فارسی میں ہیں۔ حضرت فیض کے انتقال کے بعد
ان پر حالت جذب طاری ہو گئی۔ ایک عرصہ تک مجذوب بنے رہے۔ کبھی تو حیدرآباد
سے غائب ہو جاتے اور کبھی یک بہ یک فیض کے مزار کے قریب نمودار ہو جاتے۔
مہاراجہ کشن پرشاد اور نواب مشرف جنگ کی ڈیوڑھیوں میں کبھی جا رہتے، کبھی
ایک بغل میں شراب کا شیشہ، دوسری بغل میں کتے کا بچہ لئے ہوتے۔ کچھ عرصہ کے بعد
یہ حالت دور ہوئی۔ ۶۶ سال کی عمر میں انھوں نے اپنے حالات خود لکھے ہیں

حالت جذب میں بھی شعر کہا کرتے، اور اپنے مرشد فیض کے عرس کے دن برابر حاضر رہا کرتے۔ ۱۴ رجب ۱۳۲۵ھ کو فیض کے عرس کے مشاعرے کے دن یکایک اُن کی رُوح پرواز کر گئی۔[1] کلیات غیر مطبوعہ ہے جس میں سات ہزار سے زیادہ شعر ہیں یہ نظموں، غزلوں، رباعیات، اور خمسہ جات و قصائد وغیرہ پر مشتمل ہے۔

رمز کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فطری ذوق شاعری رکھتے تھے بعض مرتبہ ایک" رات میں سو سو شعر کہہ دیا کرتے تھے۔" کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

دامن نہ چھٹے فیض کا کتنا چھڑائے کوئی
جب تک ہے رمز جسم میں تاب و تواں و روح

سرود عاشقاں ہر دم مرے تار نفس میں ہے
کبھی آواز یا ہو ہے کبھی ہو ہو کبوتر ہے

جو گونگا ہے کہے کیا الف کیا لام کیا ہے
سکوت اپنی تو منزل ہے کوئی کہہ لے جو کچھ چاہے

جواہر میں تلے گا یہ فسانہ عشق کا میرے
چھپے گا بعد میرے قصہ بن کر لعل و گوہر کا

گھٹ گئی عمر کی راتیں یونہی گرتے پڑتے
دن قریب آ گئے آرام سے سو جانے کے

---

[1] مرقع سخن جلد (۲)

طے ہوتی ہے زمین غزل کیا ہی بے تکان — اپنا قلم بھی کیا فرس خوش خرام ہے
کم ظرف ہم نہیں جو رکے میکدے سے ہاتھ — پی لیں گے اوک سے کف دست اپنا جام ہے
اے رمز حق جو پوچھئے ہم ہیں گدائے رند
بدنام شاہ سارے زمانہ میں نام ہے

بت دل جلا رہے ہیں جفا انتہا کی ہے — کعبہ کو پھونکتے ہیں دہائی خدا کی ہے
لیجا رہا ہے کھینچ کے دل کوئے یار میں — رسی گلے میں الفت زلف دوتا کی ہے
خود ان کو شوق وصل ہی لیکن کریں وہ کیا — چلتا نہیں ہے بس یہی فکر انتہا کی ہے
گھر پر نگاہ بان پڑوسی ہیں تاک میں — کم بخت دشمنوں سے مصیبت بلا کی ہے
کرتے ہیں جان بوجھ کے انسان دوڑ دھوپ
ہونا وہی ہے رمز جو مرضی خدا کی ہے

---

(۲) باقی

راجہ گردھاری پرشاد نام، باقی تخلص، محبوب نواز ونت خطاب تھا۔ سنہ ۱۲۴۴ھ میں حیدرآباد میں تولد ہوئے۔ آپکا خاندان حضرت آصفجاہ اول کے ہمراہ دہلی سے دکن میں آیا تھا۔ باقی عربی اور فارسی کی اچھی قابلیت رکھتے تھے۔ شاعری میں استاد سخن حضرت فیض سے تلمذ حاصل تھا۔ مرحوم اعلیٰ حضرت میر محبوب علیخاں کے اتالیق تھے۔ اس کے علاوہ کئی اور خدمتیں بھی انجام دیتے تھے، صاحب منصب و جاگیر تھے، سنہ ۱۳۱۴ھ میں باقی کا انتقال ہوا۔ ان کو تصوف سے خاص لگاؤ تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہندو دھرم کے احکام کی پیروی کے بھی سخت پابند تھے۔ مذہبی جوش اور ذوق شوق کے باعث کئی دیول بنائے

۱؎ تزک محبوبیہ۔ مرقع سخن، تذکرہ شعراء دکن

خیراتی کاموں اور داد و دہش میں نام پیدا کیا کئی کتابیں تصنیف فرمائیں جن میں سے اردو نظم و نثر میں چار کتابیں ہیں "بقائے باقی دیوان" ہے جو شایع ہو چکا ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

کہہ رہا ہے دل شیدائے شراب ہائے خم، ہائے سبو، ہائے شراب

بوسے اس لب کے لیا کرتا ہوں مرض دل کی دوا کرتا ہوں

گوشۂ عزلت میں رہتا ہوں میں عنقا کی طرح
خلق میں شہرہ ہے گمنامی سے میرے نام کا

مقام اپنا ہے باقی بے مقامی مکاں رکھتے نہیں جز لامکاں ہم

آگ دیتا ہوں جگر کو دل سے حق ہمسایہ ادا کرتا ہوں

گریباں چاک ہے جو گل نظر آتا ہے گلشن میں
ذرا سوچو تو کیا تاثیر ہے بلبل کے شیون میں

بام پر یار کا چہرا دیکھا طور پر نور کا شعلہ دیکھا

آپ نے لطف سے آنسو جو نہ پوچھے ہوتے
دیکھیے، پھر یہ میرا دیدہ تر کیا کرتا

حباب آسا ہے اپنا دم لبوں پر　　　کوئی دم میں ادھر ہے یا ادھر ہے[1]

---

(۳) **خرم**[2] سیتل پرشاد نام اور خرم تخلص، کایستھ قوم سے تعلق رکھتے تھے سکندر جاہ آصفجاہ ثالث کے زمانے میں ان کے اجداد حیدرآباد آکر بس گئے تھے۔ بمقام حیدرآباد ۱۲۳۸ھ میں خرم کی ولادت ہوئی شاہی تنبول خانہ ان کے سپرد تھا۔ حضرت فیض کے شاگرد تھے۔ تاریخ گوئی کا خاص ملکہ تھا۔ دیوان ہنوز طبع نہیں ہوا ہے، ۱۳۲۱ھ کے بعد انتقال ہوا۔ عرس فیض کے مشاعروں میں پابندی سے شریک ہوتے اور کلام سناتے تھے کلام کا نمونہ پیش ہے۔

میں شرابی ہوں لب میگوں کا بوسہ دیجئے
کیا میں افیونی ہوں جو دیتے ہو بوسہ گال کا

مجنوں چلا گیا یوں ہی لیلےٰ کے شہر تک
حال فراق کہتا ہوا ساربان سے

قبر میں بھی لخلخہ ہے یار کا　　　خاک پتھر دوں فرشتوں کو جواب

ہم کو فراقِ یار نے ناچار کر دیا　　　عشق ستم شعار نے بیمار کر دیا
اک دختِ رز کے عشق نے میخوار کر دیا　　　ترشیخ جی کا جبہ و دستار کر دیا
منصور کو بچا نہیں جامِ الست　　　وحدت کا راز نشہ میں اظہار کر دیا

---

[1] بقائے باقی　　[2] تزک محبوبیہ دفتر ہفتم صـ۵۷

جدا جو مجھ سے مرا رشک حور ہوتا ہے	تو اس کے ساتھ دل ناصبور ہوتا ہے

کوٹھے پہ جلوہ گر وہ بت لالہ فام ہے
اور ازدحام خلق خدا زیر بام ہے

مایوسی بڑھتی جاتی ہے فرقت میں یار کی
اب دل کے حسرتوں کو ہمارا سلام ہے

خاصیت ان بتوں میں ازل سے دغا کی ہے
امید ان سے کس کو خدایا وفا کی ہے
کیوں ڈوب کر مریں نہ بھلا بحر اشک میں
غیروں سے طبع آشنا اوس آشنا کی ہے
خرم ترے سخن میں ہے فیض جناب فیض
ہر اہل دل کے منہ میں صدا واہ واہ کی ہے

دل اپنا روئے یار پہ شیدا ابھی سے ہے
سر میں ہمارے زلف کا سودا ابھی سے ہے
ہم سے خفا جو وہ بتِ ترسا ابھی سے ہے
ہم نے بھی دل خدا سے لگایا ابھی سے ہے
کب تک امید وصل میں ہم زندگی کریں
فرقت میں چاک چاک کلیجا ابھی سے ہے

جدائی کی شکایت کر رہا تھا | جھکا کر سر کو رب العالمیں سے
یکایک آکے وہ بت میرے نزدیک | کہا دیکھو تو چشم دوربیں سے
اُٹھا کر سر کو جب دیکھا وہی ہے | ہوا میں ہم بغل و نازنیں سے
کسی کا منھ نہ دیکھوں جز تمہارے | جو آئے حور بھی خلد بریں سے

جناب فیض کی درگاہ ہے فیاض
ہے خرم فیض عالم کو یہیں سے[1]

---

(۴) تمکین

رائے بجو لعل نام اور تمکین تخلص تھا۔ فارسی زبان پر پورا عبور حاصل تھا۔ نظم و نثر دونوں میں دسترس رکھتے تھے بقول مولف تذکرہ عروس الاذکار فارسی میں استادانہ مہارت حاصل تھی۔ طبابت آپ کا پیشہ تھا اپنے وقت کے ایک ماہر طبیب تھے۔ خوشنویس بھی تھے۔ طب فرشتہ کو جو خاصی ضخیم کتاب ہے اپنے قلم سے ۱۲۷۰ھ میں نقل کیا ہے

شاعری میں تمکین کو حضرت فیض سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ "مواعظ نادر" ان کی ایک تالیف ہے، جو ۱۲۷۲ھ میں مرتب کی گئی ہے اس میں آصفجاہ اول کی اُن نصیحتوں کا ترجمہ کیا گیا ہے جو مرحوم نے اپنے فرزند ناصر جنگ کو فرمائی تھیں۔ کتاب نثر میں ہے مگر جا بجا اپنا کلام بھی درج کیا ہے۔ نمونہ حسب ذیل ہے۔

ہے وہ اک شایستۂ حمد و ثنا | کن سے دو عالم کئے جس نے بنا

خوشا نعت رسول ایزد پاک | کہ جس کی شاں میں نازل ہے لولاک

---

[1] گلدستۂ فیض۔

جہاں فانی ہے باقی ہے سوا ایک بات سنو باتوں ہی کی کل کرامات

خصوصاً بات وہ جو کام کی ہو نہیں آغاز کی انجام کی ہو

کیا قضا کا ہے طبیبوں سے علاج آن میں ہو جائے برگشتہ مزاج

جب قضا پہنچے تو الٹی ہو دوا آب حیواں میں اثر ہو زہر کا

گو کہ جاتے ہیں جان سے لیکن بات مردوں کی جان رکھتی ہے
مرتے مرتے وہ لکھتے گئے ہیں کہ جہاں جس پہ کان رکھتی ہے

دشمن و دوست پر موقوف نہیں تا مقدور
صلح ہر ایک سے بہتر ہے نہیں بہتر جنگ[۱]

---

(۵) **خلق**[۲] رائے جاو رائے نام اور خلق تخلص۔ حضرت فیض کے شاگردوں میں شامل تھے۔ افسوس ہے کلام بہم دست نہ ہو سکا۔

(۶) **نشاط**[۳] لالہ تلجا رائے، نشاط تخلص۔ آپ بھی فیض کے شاگرد تھے حیدرآباد وطن تھا۔ کلام کا نمونہ دستیاب نہ ہو سکا۔

(۷) **وفا**[۴] انباجی راؤ نام اور وفا تخلص تھا، جناب لایق سے تلمذ رکھتے تھے۔ حضرت فیض کے مشاعرے میں اپنا کلام سنایا کرتے۔

---

[۱] مواعظ نادر مخطوطہ کتب خانہ سنٹرل ریکارڈ آفس [۲] [۳] مرقع سخن جلد اول [۴] گلدستۂ فیض

نصرت قریں ہے شاہ سعادت سپاہ سے
اور فخر ہے قشوں مظفر کو شاد سے
کہتی ہے جس کو آصف سادس تمام خلق
محبوب ہے علی کا وہ بفضلِ الٰہ سے
ہوتے ہی چار چشم سناتے ہیں گالیاں
اُمید لطف کیا مجھے اس کج کلاہ سے
دل برق ہے تو رعد فغاں گریہ مطر ہے
یہ آسماں بنا ہے مری دردِ آہ سے[1]

---

(۸) احسان رائے گوبند پرشاد نام اور احسان تخلص تھا۔ قوم کے کایستھ تھے حضرت فیض کے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔

پنہاں در دنداں جو ہوے میری نظر سے
بے تاب ہوں آنسو ہیں رواں دیدۂ تر سے
دولت سے نہ جاگیر سے منصب سے نہ زر سے
توقیر ہے انساں کی فقط علم و ہنر سے
دل چھد گیا سوراخ جگر میں ہوئے لاکھوں
کیا کام کیا آپ نے اک تیرِ نظر سے
عشقِ در دنداں میں اجل آئی ہے مجھ کو
دو غسل مری لاش کو تم آب گہر سے
لے جا کے رکھا چشمۂ حیواں پہ جو محروم
اُمید سکندر کو نہ ایسی تھی خضر سے

[1] گلدستۂ فیض

احسان کا بدل خلق میں احسان ہے گویا
دشنام ادھر سے ہیں دعائیں ہیں ادھر سے[1]

---

(۹) فرحت رائے بالا پرشاد المتخلص بہ فرحت۔ حیدرآباد وطن تھا۔ یہاں عمر بسر کردی۔ شاعری کا بہت شوق تھا! ول جناب مہدی سے تلمذ تھا۔ پھر حضرت داغ کے شاگردوں میں شامل ہوئے۔ جناب فیض کے مشاعروں میں پابندی سے شریک ہوتے اور اپنا کلام سناکر تعریف اور ستایش کے تمغے پاتے تھے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

سمجھے کوئی یارب مرے مجروح جگر سے
بے تاب کیا ان کو بھی نالوں کے اثر سے
معلوم ہوا ہم کو یہ وحشت میں سفر سے
آرام زیادہ نہیں ملتا کہیں گھر سے
اُس تیغ ادا نے تیری کیا کام کیا ہے
دل میں بھی اتر آئی ہے ظالم یہ جگر سے
سرگرم تغافل ہیں ابھی سے تری آنکھیں
کیا خاک ہو اُمید ہمیں ایسی نظر سے

پھر مجھکو دل نے طالب دیدار کردیا
پھر مجھکو انتظار نے بیمار کردیا
ساقی اُٹھا لے بزم سے سامان میکشی
مجھکو نگاہِ مست سے سرشار کردیا

[1] گلدستہ فیض

اُمیدیں دل کی دل ہی میں سب خون ہو گئیں
افسوس اُس نے وصل سے انکار کر دیا

اللہ سے غرض ہے محمدؐ سے کام ہے
میری زباں پہ نہیں دوسرے نام ہیں

ہر ایک پردہ میں جس کا ظہور ہوتا ہے
خیال اس کا کہیں دل سے دور ہوتا ہے
جو دیکھ لیتا ہوں ساقی کی آنکھ متوالی
خمار آنکھوں میں دل کو سرور ہوتا ہے
تم اپنے ہاتھ سے غیروں کو جام دیتے ہو
ہمارا شیشۂ دل چور چور ہوتا ہے
نہیں جو رکھتا دل میں تمہاری اُلفت کو
خدا کے فضل و کرم سے وہ دور ہوتا ہے[1]

---

(۱۰) اشعر

راجہ رام پرشاد، اشعر تخلص، صاحب جاگیر و منصب تھے
ان کے چچا تلجارام مشاہیر حیدرآباد سے تھے۔ اشعر
فیض کے مشاعروں میں اپنا کلام سناتے تھے۔ جناب حمید سے تلمذ رکھتے تھے۔

جو چار چشم میرا رشک حور ہوتا ہے
غبار غم دل محزوں سے دور ہوتا ہے
کسی کے نرگس مخمور کے تصور میں
عیش خراب دل ناصبور ہوتا ہے
شہید تیغ نگاہ صنم کو بعد فنا
لحد کا گوشہ بھی آغوش حور ہوتا ہے

---

[1] گلدستۂ فیض

کہے گا پیشِ خدا حشر میں یہی شعرؔ
اُمیدِ عفو ہیں مجھ سے قصور ہوتا ہے

کعبہ سے غرض نہ کلیسا کے راہ سے
بخشش کی ہے امید تری بارگاہ سے[۱]

---

(۱۱) **بالکشن** رائے بالکشن نام اور بالکشن ہی تخلص تھا۔ فیض کے مشاعروں میں کلام سنایا کرتے تھے۔ فارسی اردو میں کافی مہارت رکھتے تھے

خط کا جواب ہے نہ پیام و سلام ہے
ان کا قصور کیا میری قسمت کا کام ہے

اے دل سنبھل کے کوئے ستمگر میں رکھ قدم
اُسکی گلی میں معرکہ قتلِ عام ہے

ہے رُخ سے اُن کے روشنیٔ صبح کا ظہور
وہ زلف جو کھولتے ہیں تو ہو جاتی شام ہے

قسمیں نہ کھاؤ جانتا ہوں عہد آپ کے
پہلی کا جو وعدہ ہے تو مہینا تمام ہے

طفلی یہ میری اور یہ صدمے فراق کے
بس عشق کو تو بالکشن رام رام ہے[۲]

---

(۱۲) **حکیم** جنار دھن پرتاب صاحب المتخلص بہ حکیم، حکمت کا پیشہ کرتے تھے تخلص بھی اسی مناسبت سے رکھا تھا۔ فیض کے

---

[۱] و [۲] گلدستہ فیض۔

مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔

خیال اور کہیں اسے حضور ہوتا ہے
غلام قدموں سے آقا کے دور ہوتا ہے

خدا کی شان کا جلوہ ہے جو طرف دیکھو
ہر ایک شے میں اُسی کا ظہور ہوتا ہے

کبھی ٹلا نہ ٹلے گا نوشتۂ ازلی
نصیب میں جو لکھا ہے ضرور ہوتا ہے

شب وصال میں وہ دیکے گالیاں کہتا
معاف کیجئے مجھ سے قصور ہوتا ہے

ہے نام پاک میں حضرت کے کس قدر تاثیر
کہ جس کے سننے سے دل کو سرور ہوتا ہے[۱]

---

(۱۳) دبیر

رائے جانکی رام صاحب نام اور دبیر تخلص کرتے تھے فیض کے مشاعروں میں کلام سنایا کرتے تھے۔

کمال حسن میں بھی اک فتور ہوتا ہے
حسین جتنے ہیں انکو غرور ہوتا ہے

یہی معاملہ اے رشک حور ہوتا ہے
کہ تجکو حور بھی کہنا قصور ہوتا ہے

جمالِ یار مرے دل میں ہے جو عکس فگن
خیال اس کا مجھے کوہ طور ہوتا ہے

ہماری یاد کسی کو ضرور آتی ہے
ہمارا ذکر کہیں اب ضرور ہوتا ہے

کسی کی شکل نہیں بھولتی ہے دل سے دبیر
ہو دور آنکھوں سے کیا دل سے دور ہوتا ہے[۲]

---

[۱] و [۲] گلدستۂ فیض۔

(۱۴) **دلبر** سنتوش راؤ صاحب المتخلص بہ دلبر۔ علاقہ پائیگاہ میں ملازم تھے۔ شعر و شاعری سے دلچسپی تھی اس لئے شعر موزوں کرتے اور مشاعروں میں داد سخن لیتے تھے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

افسانہ ان کے آنے کا خواب و خیال ہے
ہونا وصال یار کا امر محال ہے

کرتے ہیں ہر ادا میں ہزاروں کے دل شکار
آنکھ اسکی شوخ غیرتِ چشم غزال ہے

بن ٹھن کے آرہے ہیں وہ عاشق کے قتل کو
شمشیر ہاتھ میں ہے پس پشت ڈھال ہے

غیروں کو آج دیکھ کے انجان ہو گئے
کل مجکو کیا کہا تھا تمھیں کچھ خیال ہے

ہوگا وصال آج ہی کل میں ترا دلبر
یہ قول ہر منجم فرخندہ فال ہے

---

(۱۵) **سامی** ویرا سامی نام اور سامی تخلص کرتے تھے، حضرت معلےٰ سے تلمذ حاصل تھا۔ فیض کے مشاعروں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے، تصوف سے لگاؤ تھا۔

اک دن کشش عشق اُنہیں لائیگی گھر سے
سیدھی مری آنکھ پھڑکتی ہے سحر سے

کیا دیکھ سکے جلوہ انوار تجلی
خورشید بھی شرمندہ ہے اس رشک قمر سے

ت ۔ گلدستہ فیض

مل جائیں گے بوسے لب شیریں کے کسی روز
ساقی مجھے کچھ کام نہیں شیر و شکر سے

گو یاد سے مری وہ فراموش ہو تو کیا
دن رات مجھکو ساقی اسی کا خیال ہے

غرض دنیا سے ہے مجھکو نہ دیں سے — فقط مطلب ہے یار مہ جبیں سے

جو اس دام بلا میں ہیں وہ باہر جا نہیں سکتے
کہ مشکیں عاشقوں کی زلف مشکیں اونکی کستی ہے
جہاں میں بھی عجب ہے گرمی بازار میخواری
ملی گر اشرفی کو ایک بوتل بھی تو سستی ہے[1]

---

(۱۶) شہرت | چندی سنگھ صاحب المتخلص بہ شہرتؔ، راج پوت تھے شاعری کا مذاق رکھتے تھے، جناب فاخر حیدرآبادی سے تلمذ تھا، فیضؔ کے مشاعروں میں غزل سناتے تھے۔

بے مثل ان کا حسن ادا بے مثال ہے
نرگس ہے چشم ابروئے جاناں ہلال ہے
جب وصل چاہتا ہوں تو خاموش رہتے ہیں
شاید وہ نیم راضی ہیں جب تو یہ حال ہے

---

[1] گلدستۂ فیض

اک دق رہے گا دل مرا ہو کر اسیرِ عشق
تارِ نظر کے پھندے ہیں زلفوں کا جال ہے
تو ہی مدد کرے تو کرے اے جنونِ عشق
اب دو قدم بھی ضعف سے چلنا محال ہے
شہرت ترے کلام کے چرچے ہیں جابجا
آگے غضب کرے گا ابھی تو یہ حال ہے[۱]

---

(۱۷) صدق

رائے تاراچند نام اور صدق تخلص کرتے تھے، میر خیرات علی صاحب سخی مرحوم کے تلامذہ میں شامل تھے، مشاعروں میں کلام سنا کر داد سخن لیتے تھے، اکثر طویل غزلیں موزوں کرتے تھے۔

ہے شام وصل شق مرا سینہ ابھی سے ہے
صبح فراق دور ہے دھڑکا ابھی سے ہے
پنہاں نقاب میں رخ زیبا ابھی سے ہے
عاشق سے اس حسین کو پروا ابھی سے ہے
گلشن بنے گا چار ہی دن میں یقین ہے
ہر داغ سینہ گل کا نمونہ ابھی سے ہے
وقت سوال کام یہ آئے گا قبر میں
نام اس صنم کا سینہ پہ کندا ابھی سے ہے
جلنے کو سوز ہجر میں پروانہ کی طرح
آمادہ یہ مرا دل شیدا ابھی سے ہے

---

[۱] گلدستہ فیض

عاصی تو ہوں ڈرا ؤ نہ اے واعظ مجھے
رحمت پہ اس کی مجکو بھروسا ابھی سے ہے
دو چار شعر صدق نے اپنے سنائے ہیں
فیض سخن کا بزم میں پر چرچا ابھی سے ہے

امید کب فراق میں ہم کو بقا کی ہے
دل میں بھری ہوئی ہوس اپنی فنا کی ہے
چکر ہی میں گذرتی ہے دن رات کیا کہوں
گردش مرے نصیب میں کیا انتہا کی ہے
جب سے عدم کو چھوڑ کے آیا ہوں دہر میں
دل سے مجھے تلاش اسی دلبر ربا کی ہے
اے صدق میرے شعر میں مرغوب خاص و عام
فیض سخن ہے مجھ پہ عنایت خدا کی ہے[1]

---

(۱۸) فہیم محبوب سنگھ المتخلص بہ فہیم جناب فاخر حیدرآبادی سے شرف تلمذ تھا، مشاعروں میں شریک ہوتے اور کلام سنایا کرتے۔

تا مرگ حسینوں کا خریدار رہونگا
سر لے ہی جائے گا یہ سودا مرے سر سے
انکار گلے ملنے سے ہے آپ کو اچھا
کیا رات کو نکلیں گے نہ باہر کبھی گھر سے

---

[1] گلدستہ فیض

رہتی ہے خفا مجھ سے تری نرگس بیمار
پرہیز ہے کیا اس کو عنایت کی نظر سے
تصویر میں تیری ہے سوا تجھ سے رعونت
اُٹھتا نہیں دم بھر کے لئے ہاتھ کمر سے
مالک ہے فہیم اب دل بیتاب کا اللہ
ممکن نہیں بچ جائے جو اس تیر نظر سے[1]

---

(۱۹) فاضل رائے جولا پرشاد المتخلص بہ فاضل، رائے موہن لعل صاحب کے فرزند تھے۔ موہن لعل صاحب توشک خانہ حضور کے مشرف (مہتمم) تھے، فاضل کی اردو فارسی قابلیت مسلمہ تھی، شاعری سے بڑی دلچسپی تھی، مگر زیادہ تر فارسی غزلیں لکھا کرتے تھے۔ کبھی کبھی اردو میں بھی طبع آزمائی فرماتے تھے۔ فیض کے مشاعروں میں فارسی غزلیں سنایا کرتے تھے۔

(۲۰) مسرور رائے بھگراج نام اور مسرور تخلص تھا۔ میر خیرات علی خاں سخی سے تلمذ حاصل تھا۔ حضرت فیض کے بڑے معتقد تھے۔ سالانہ عرس کے موقع پر پابندی سے شریک ہوتے اور مشاعرہ میں اپنا کلام سنا کر داد تحسین اور آفرین لیتے تھے۔ دفتر صدر محاسبی میں ملازم تھے۔

ساقی یہ تیرے ہجر کا صدمہ ابھی سے ہے
شیشہ ہمارے دل کا شکستہ ابھی سے ہے
محشر میں کیا گناہوں کی پرسش ہو دیکھئے
دل میں کمال خوف خدا کا ابھی سے ہے

---

[1] گلدستہ

فیاض دیں سے پہونچیگا مسرورؔ تجھکو فیض
جاری جوان کے فیض کا چشمہ ابھی سے ہے

مدینہ میں بلالو مجکو بس اب شاہِ دیں جلدی
بجائے حق پرستی ہند میں اب بت پرستی ہے
جو مقبول خدا ہوتا ہے دیتی ہے اوسے راحت
جو معتوب خدا ہوتا ہے اسس کو گور کستی ہے
نہ اتراؤ جوانی پر یہ دولت چند روزہ ہے
جسے ہوتا ہے اوج اوس کیلئے اک روز پستی ہے
چلے آتے ہیں دل میں سینکڑوں ارمان عاشق کے
جگہ تل بھر نہیں باقی عجب آباد بستی ہے
سدا ابر کرم چھایا ہوا مسرورؔ رہتا ہے
نبی کی قبر پر اللہ کی رحمت برستی ہے

ساقی نے مجھ سے وصل کا اقرار کر دیا
نشہ میں دل کے راز کا اظہار کر دیا
دیدار یار پھر نہ میسر ہوا مجھے
پیدا اس نے جب وزن دیوار کر دیا
پوچھا جو شاہ حسن نے مجھ سے مراد دل
اظہار مدعا سر بازار کر دیا
قاتل نے آج تیغ کے جوہر دکھائے
کوچہ میں اپنے لاشوں کا انبار کر دیا
مسرورؔ میں بھی پھنس گیا دنیا کی جال میں
اس نفس بد نے مجھ کو گنہ گار کر دیا

لـه گلدستہ فیض

(۲۱) کرمؔ

راجہ بھگوان سہائے متخلص بہ کرمؔ۔ آپ کے جد اعلیٰ راجہ ساگر لال آصف جاہ اول کے ہمراہ حیدرآباد آئے اور یہاں دفتر مال کے سر دفتر بنے۔ کرمؔ کی پیدائش بمقام حیدرآباد ۱۲۸۵ھ ہجری میں ہوئی۔ سٹی ہائی اسکول میں تعلیم ہوئی، اردو، فارسی، انگریزی میں کافی مہارت حاصل تھی۔ مرہٹی اور سنسکرت سے واقف تھے۔ آصف جاہ سادس نے راجہ کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ ظہیرؔ دہلوی سے تلمذ تھا کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

کشتۂ ناز تھا ہر ایک خریدار نہ تھا
عرصۂ قتل تھا وہ حسن کا بازار نہ تھا

نہ رہا کوئی مجاور مرے بالین مزار
بیکسی تو ہی رہی میری نگہباں اب تک

تصویر خیالی تری کھچوائیں گے دل میں
اس خانۂ ویراں کو ہم آباد کریں گے

آئینہ کس نے اُن کو دکھلایا　　آج وہ منہ بنائے بیٹھے ہیں

وہ ناتواں جو نہ تصور میں آسکے　　کھینچے وہ ناز غیر کے کیونکر اٹھا سکے

کیا سخت جانیوں نے کیا مجھکو منفعل
آخر کو وہ گلے پہ نہ خنجر چلا سکے

اے چارہ گر مسیح بھی آئے تو کیا حصول
کشتہ ہوں اُن لبوں کا کوئی کیا جلا سکے[1]

---

(۲۲) بہجت راجہ سری رنگ پرشاد نام، بہجت تخلص، حیدر آباد کے ایک امیر اور جاگیر دار تھے۔ فیض کے عرس کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔

خوش رہے حال دوستان فیض ہو ویں برباد دشمناں فیض
اون کا ارشاد راہ پر لایا راہ پر ہو گئی زبان فیض
مستفیض اک جہان ہے بہجت
ہے عجیب شان آستان فیض[2]

---

(۲۳) نیک رائے انندی پرشاد نام اور نیک تخلص۔ حیدر آباد وطن تھا۔ "عصر" سے جو فیض کے خاص شاگرد تھے تلمذ تھا۔ فیض کے عرس کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔

قبلہ ہے مشفقو مکان فیض کعبۂ برحق ہے آستان فیض
جتنے ہیں ذی کمال و ذی عزت سنتے ہر دم ہیں داستان فیض
آج تقریب عرس ہے آؤ فاتحہ پڑھے بر روان فیض
ہے یہی نیک کمتریں کا ورد
رحمت حق شور بجان فیض[3]

---

[1] تزک محبوبیہ دفتر ہفتم صفحہ ۱۴۵ [2] [3] گلدستۂ فیض

(۲۴) **افضل** رائے شنکر پرشاد متخلص بہ افضلؔ، حیدر آباد وطن تھا۔ جناب سخیؔ سے تلمذ رکھتے تھے۔ فیضؔ کے عرس کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔

متحمل نہ رہے ہجر میں تم کھانے کے
منتظر بیٹھے ہیں فرقت میں اجل آنے کے

رات دن عالمِ وحشت میں لگا رہتا ہوں
ہوش رہتے نہیں قائم ترے دیوانے کے

ابھی کم سن ہو نہ دعوائے کرو معشوقی کا
پہلے کچھ سیکھ لو انداز ستم ڈھانے کے

فصل گل آئی ہے جس دن سے چمن میں ساقی
بھیڑ رندوں کی ہے در پر ترے میخانے کے

ہو گئی وقت سحر شمع بھی رخصت آخر
کون روئے گا بھر نعش پہ پروانے کے

کہتا ہوں حال گزشتہ تو یہ فرماتے ہیں
ذکر کیا کرتے ہو گذرے ہوئے افسانے کے

ابھی افضلؔ ہے لحاظ اون کے لڑکپن کے سبب
ابھی کچھ ڈھنگ طبیعت میں ہیں شرمانے کے[۱]

---

(۲۵) **شاد** اس دور کے مشہور شاعر حضرت شاد یعنی مہاراجہ کشن پرشاد کا تذکرہ آگے چل کر کیا جائے گا۔ یہ دوسرے شادؔ تخلص کے

---

[۱] گلدستہ فیض

شاعر ہیں، ان کا نام گنیش پرشاد تھا، صاحب جاگیر تھے۔ راجہ کا خطاب بھی تھا انکے والد راجہ شمبھو پرشاد تھے۔ شاد کو صفی سے تلمذ حاصل تھا۔ فیض کے مشاعروں میں اپنا کلام سناتے تھے۔

آئے کس ناز سے قربان میں اس آنے کے
میں تو میں غیر بھی مشتاق ہیں مر جانے کے

جس کا جی چاہا اٹھا درد اٹھا رنج اٹھا
ہم بھی سہتے رہے مشتاق ترے آنے کے

لیکے دل چھوڑ بھی دو مجرم الفت کو حضور
چھوٹے تقصیر سزا وار ہے جرمانے کے

کام آئیں گے دم پرسش اعمال بہت
تم سکھا دو مجھے کچھ ڈھنگ مکر جانے کے

عشق ابرو میں کٹی عمر ہماری اے شاد
زندہ جب تک تھے رہے خوف میں مر جانے کے

---

(۲۶) خبیر رائے نرہری پرشاد المتخلص بہ خبیر، حیدرآباد کے ایک خوش فکر شاعر تھے۔ فیض کے مشاعروں میں کلام سنایا کرتے تھے۔[۱]

نہاں نہیں کوئی احوال کیا بیاں کردوں
عیاں ہے تم پر مرے حال زار کی صورت

خراب و خستہ پھریں انکے عشق میں کب تک
بتاؤ کوئی تو عز و وقار کی صورت

---

[۱] گلدستہ فیض

دکن سے ہند چلو ہند سے چلو کہیں اور
ہے آتی یہاں تو نہیں روزگار کی صورت
ہے خیر چہرۂ روشن کا ان کے پروانہ
فقیر تکتے رہے مال دار کی صورت

وصل کے وعدہ پہ کیا ہی وہ پریشان ہوئے
قول سیدھے بھی حضور ان کے ہیں الجھانے کے
شیشۂ دل کو مرے سنگِ تغافل پہ پٹک
صاف ٹکڑے سے کئے مینوش نے پیمانے کے
رہنما دل کے عقیدے کی سڑک ہے ہموار
خلد و فردوس میں رستے ہیں چلے جانے کے

---

(۲۷) سخن | منوہر پرشاد المتخلص بہ سخن، اس دور کے شاعر ہیں۔ حضرت سخی مرحوم سے تلمذ رکھتے تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد سے مراسم اس زمانے سے رکھتے تھے جبکہ وہ وزیر فوج اور پیشکار تھے۔ مہاراجہ کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔

آنکلے تو کبھی صورت دکھانے کے لئے
بام پر روکا ہے کس نے آنے جانے کیلئے
پھیر دی تلوار میرے حلق پر کیوں آپ نے
میں ہی تھا کیا جوہرِ تیغ آزمانے کے لئے

---

۵ گلدستۂ فیض ۶ قصائد وزارت شاد

(۲۸) صبر — چنی لال نام اور صبر تخلص کرتے تھے، مہاراجہ کشن پرشاد سے اسی زمانہ سے تعلق تھا جبکہ آپ ہنوز دیوان نہیں ہوئے تھے۔ حضرت سخی سے آپ کو بھی شرف تلمذ تھا۔

آج وعدہ کر لیا تھا اُس نے آنے کے لئے
اس لئے قاصد کو بھیجا ہوں بلانے کے لئے
خاکساری شیوۂ انسانیت ہے برملا
خلق ہیں پیدا ہوئے مٹی میں جانے کے لئے
وہ تو دل سے عاشق شیدا تمہارا ہے صنم
رُکتے ہو کیوں صبر کے گھر میں تم آنے کے لئے[۱]

---

(۲۹) نظر — گردھاری پرشاد نام نظر تخلص تھا۔ حضرت شاد کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ سخی مرحوم سے تلمذ رکھتے تھے۔ حضرت فیض مرحوم کے مشاعروں میں بھی شریک ہوا کرتے تھے۔

گاہ فرحت گاہ رنجش برملا رکھتے ہیں وہ
رنج رونے کے لئے فرحت ہنسانے کیلئے
دیکھتا جاتا ہے نظروں سے نظر دل نگار
بھید قدرت کا نہیں ظاہر ہے پانے کیلئے[۲]

جو چاہو ظلم کرو ہم پہ صاحب — شکایت تو کریں گے ہم تمہیں سے
الٰہی تخت آصف رکھ تو قائم — دعا یہ مانگتا ہوں شاہ دیں سے[۳]

---

[۱] قصائد وزارت شاد [۲] گلدستہ فیض۔ [۳] قصائد وزارت شاد

۸۴

(۲۰) **ہنر** رائے انبا پرشاد ہنرؔ تخلص بہ ہنر حضرت تحّمی سے تلمذ رکھتے تھے مہاراجہ کشن پرشاد سے اسی زمانہ سے مراسم تھے جبکہ وہ دیوان نہیں ہوئے تھے۔ جب مہاراجہ کو دیوانی ملی تو پھر آپ سے وابستہ رہے۔

نزع میں دیکھا فرشتے کو تو میں سمجھا یہی
قاصد دل دار آیا ہے بلانے کے لئے

کاوشوں میں مبتلا کرتی ہے کیوں دنیائے دوں
چند دن مہماں ہیں آتے ہیں جانے کے لئے[1]

---

(۲۱) **میطر** رائے جانکی پرشاد نام اور میطرؔ تخلص ان کے والد جے پور سے ۱۲۵۸ھ میں حیدرآباد آکر یہیں بس گئے تھے۔ میطرؔ کی پیدائش ۱۲۸۶ھ حیدرآباد میں ہوئی۔ فارسی اور اردو کی تعلیم پائی۔ شاعری میں اولاً ضیاء دہلوی سے تلمذ رہا، اس کے بعد محمد نادر علی برترؔ سے اصلاح سخن لیتے رہے، ۱۳۲۶ھ میں انتقال ہوا۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

یہ نگاہیں لڑ رہی ہیں کس سے آج
آئینے میں کون پیدا ہو گیا

بیقراری کس قیامت کی شب وعدہ رہی
تم نے کچھ غفلت سہی کی کچھ موت نے تاخیر کی

گالیاں دیتا نہیں تو پیار سے
پھول جھڑتے ہیں تری گفتار سے

---

[1] گلدستۂ فیض

حشر میں اب کیا توقع داد خواہی کی رکھوں
میں ہوں تنہا ہو گئی ساری خدائی آپ کی

اُن کی محفل سے میں نکل آیا	مدعا بن کے مدعی کے لئے

ہر ایک بات پر تم جھگڑہ مچا رہے ہو
بیچارے عاشقوں کو ناحق ستا رہے ہو

ہو گیا اور خفا وہ بت بے پیر عبث
منتیں کیں تیری اور نالہ شبگیر عبث[1]

---

(۲۳۲) نفیس[2] بھوانی پرشاد المتخلص بہ نفیس، کایستھ قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اجداد برار کے رہنے والے تھے، نفیس کے والد چنی لال حیدرآباد آئے۔ اس زمانے میں نفیس کم سن تھے۔ حیدرآباد میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی شاعری میں محمد سرفراز علی وصفی سے تلمذ تھا۔ بعد تعلیم وکالت شروع کی، اپنے وقت کے مشہور اور معروف وکیل تھے۔ ۱۳۲۵ھ میں بقید حیات تھے۔ کلام کا نمونہ درج ہے۔

بتوں کو سنگ دل حق نے بنایا	بجاؤں شیشۂ دل میں کہاں سے
فقط نفرت ہی مجھ سے ورنہ اے جاں	محبت ہے تمہیں سارے جہاں سے
ترے ایوان کا اللہ رے رتبہ	وہ باتیں کر رہا ہے آسماں سے
ہوا اچھا جو سر قاتل نے کاٹا	سبک میں ہو گیا بار گراں سے

---

[1] یادگار ضیغم

نفیس اب تجھ سے وہ گویا نہ ہوگا کیا ہے لال منہ کو اس نے پان سے[۵]

عمر بھر وعدے کئے افسوس آنے کے لئے
جاں لبوں پر آگئی آخر کو جانے کے لئے

آپ کو غیروں سے الفت ہے تو ہم بھی پر ضرور
ڈھونڈھ لینگے اور دلبر دل لگانے کے لئے[۲]

---

(۳۳) **جوہر** تلجا رام المتخلص بہ جوہر ہمستان گر گنٹہ ضلع رائچور میں ناظم عدالت تھے ۔ نہ معلوم اب بقید حیات ہیں یا کیا ؟ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے ۔

بھول جھڑتے ہیں ترے منہ سے بوقت تقریر
گفتگو میں تری ہم نے چمنستاں دیکھا

جب سے وہ دیوانہ ترا قید سے مر کر نکلا
پھر نہ آباد کبھی خانہ زنداں دیکھا

ہوں وہ شوریدہ قسمت کہ نہیں کچھ بنتی
کبھی نہ دل سے نکلتا ہوا ارماں دیکھا[۳]

---

(۳۴) **خاطر** رائے سورج نارائن نام اور خاطر تخلص ، کالیستھ قوم سے تھے ۔ حضرت ظہیر دہلوی سے تلمذ تھا بلکہ اُن کے شاگرد رشید تھے ۔

۵۔ یادگار ضیغم ۲۔ قصائد وزارت شاد ۳۔ سخنوران دکن ص ۲۳

مائل ہوا ہے یار، وفا پر جفا کے بعد
دی ہے زبانِ وصل ہزار التجا کے بعد
رحم و کرم سے اُس کے عجب کیا جو بخش دے
بندے کے ہر قصور کو اُس کی خطا کے بعد
جلوہ دکھا کے دل تو وہ پہلے ہی لے چکے
جانی رہے گی جان بھی ناز و ادا کے بعد
اپنی مُراد بھی جو بر آئے تو کیا عجب
انساں کو کیا ملا نہیں فضل خدا کے بعد[1]

---

(۳۵) خوشتر

بشن سنگھ، خوشتر تخلص، حضرت زیرک مرحوم سے تلمذ تھا۔ خوش فکر شاعر تھے۔ نظم و نثر دونوں میں اچھی مہارت تھی، کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

رنگ محفل میں جماتے ہیں وہ یکتائی کا
لو ہوا شوق انہیں انجمن آرائی کا
ساتھ چھوٹے نہ رُخ یار سے رعنائی کا
حُسن کے ہاتھ میں دامن رہے زیبائی کا

میں ایک تڑپ میں کروں لاکھوں بجلیاں پیدا
اگر میری یہی بے تابیاں رہیں برسوں

---

[1] سخنوران دکن صفحہ ۱۶۰

تری فغاں میں اثر ہوا بھی سے کیا معنی
کہ مشق چاہیئے تجھ کو دل حزیں برسوں[1]

---

(۳۶) نظم ٹھاکر پرشاد، نظم تخلص، ثاقب لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ پھر نقی سے بھی تلمذ رہا۔ اچھے شعر موزوں کرتے تھے۔ فیض کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔

کسی پر ہو گیا جب سے فدا دل | نہیں قابو میں ہے میرے مرا دل
جب اُس کا اور میرا مل گیا دل | عدو کا رشک سے ٹکڑے ہوا دل
رہوں محو تماشائے حقیقت | ابھی کر دے تو ایسا مرا دل
کبھی لیتے کبھی دیتے ہیں واپس | کھلونا بن گیا ان کو مرا دل[2]

وحشتِ دل کی حقیقت میں کہوں کیا جا کر
اپنے دیوانے کو وہ بھی نہیں سمجھانے کے
ہم جب آتے ہیں تو آنچل سے چھپا لیتے ہیں مُنھ
کب سے یہ ڈھنگ تمھیں آتے ہیں شرمانے کے
آج وہ زلف سیہ بزم دکھاتے ہیں اگر
بیڑیاں پاؤں میں پڑ جائیں گے دیوانے کے

اُوٹھ گیا لطف شاعری اے نظم
رہ گئی لب پہ یہ داستان فیض[3]

---

[1] سخنوران دکن [2] سخنوران دکن ص۳۵۹ [3] گلدستہ فیض

(۳۷) رفعت

مرلی منوہر نام، مہاراجہ آصف نواز ونت بہادر خطاب اور رفعت تخلص کرتے تھے۔ کالیستھ قوم کے ایک برآوردہ امیر تھے آپکے مورث اعلےٰ راجہ ساگرمل آصف جاہ اول کے ہمراہ شمالی ہند سے آئے تھے۔ آصف جاہ نے ان کو دفترمال کا سردفتر مقرر کیا تھا۔ رفعت کو فارسی، اردو میں ید طولےٰ حاصل تھا۔ ایک عرصہ تک سلطنت آصفیہ میں صدر محاسب رہے مسٹر واکر صدر المہام فینانس نے آپ کو پیرانہ سالی کی وجہ سے وظیفہ پر علیحدہ کر کے مسٹر حیدری کو اس جگہ پر مامور کیا تھا۔

رفعت پر گو شاعر نہیں تھے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

شادی سالگرہ کا یہ جشن عشرت
آج کیوں کر نہ ہو ہر شخص کے دل پر فرحت
روکش جیں ہے یہی غیرت پیرس ہے یہی
آکے دیکھے کوئی اس ملک کی شان و شوکت
خیر خیرات کریں عیش کریں شاد رہیں
ہے اسی واسطے سب اہل دکن کو رخصت
رات دن شاہ کو سب لوگ دعا دیتے ہیں
اب نہیں اور کسی بات کی ان کو فرصت
عمر و اقبال بڑھے ملک بڑھے راج بڑھے
رات دن فضل خدا سے ہے بڑھتی دولت
ہر گلی کوچہ میں بازار میں کہتی ہے صبا
حیدرآباد میں ہر دم ہے عیش و عشرت
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں بے بس ہو کر

دشمنوں کی تری سب ٹوٹ گئی ہے ہمت
باغ آصف رہے سرسبز جہاں ہے جب تک
اور اس پر رہے خدا کی رحمت
میر محبوب علی شاہ کے زیر نعلین
زندگی اپنی گذر جائے گی اچھی رفعت

---

(۳۸) اکرم راجہ بھگوان سہائے بھی کالیستھ قوم کے شاعر اور حیدر آباد کے امیر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے سنہ ۱۲۸۶ھ میں تولد ہوئے اور سنہ ۱۳۲۷ھ میں انتقال ہوا۔ ظہیر دہلوی سے شرف تلمذ تھا۔ صدر محاسبی حیدر آباد میں مددگار تھے۔

(۳۹) حشمت کرپا شنکر نام اور حشمت تخلص کالیستھ قوم کے سربرآوردہ فرد تھے۔ آپ کا خاندان آصف جاہ اول کے ہمراہ شمال ہند سے دکن آکر بس گیا۔ آپ کے والد رام دین صاحب راجہ موتی پرشاد المخاطب بہ کرن بہادر کے داماد تھے، حشمت کی پیدائش سنہ ۱۲۷۰ھ میں حیدر آباد میں ہوئی اردو، فارسی، انگریزی کی تعلیم پائی۔ حیدر آباد کے مشہور حکیم اسحاق حسن صاحب سے طب یونانی اور ڈاکٹر لقمان الدولہ سے ڈاکٹری کی تعلیم پائی۔ ایک عرصہ دراز تک دونوں طریقوں سے مفت علاج کرتے رہے۔ راجہ شیوراج کی فیملی اور انکے اسٹاف کے سرجن تھے شعر و سخن سے دلچسپی تھی استاد سخن تسلیم کئے گئے تھے۔ آپکے شاگردوں کا دائرہ وسیع تھا۔ انتقال سے پہلے بصارت سے معذور ہو گئے سنہ ۱۳۵۰ھ میں انتقال ہوا۔ دیوان مرتب کیا تھا مگر افسوس ہے اسکی طباعت نہیں ہوئی۔ غزل گو شعرا میں شامل ہیں۔ تاریخ گوئی میں خاص ملکہ رکھتے تھے

کلام کا نمونہ پیش ہے۔

فلک سرگرم ہیں کس قدر بجلی گرانے میں
بجز خاشاک ہے کیا اور میرے آشیانے میں

لگ گئی اک آگ سی یارب دلِ دلگیر میں
ہائے کیا جادو بھرا تھا اُس نے نوکِ تیر میں

باغباں شکوۂ بیداد کروں یا نہ کروں
نو گرفتار ہوں فریاد کروں یا نہ کروں

ترے عاشق وہ ہیں اپنے کو جو بے خانماں کرلیں
زمیں کو آسماں کرلیں مکاں کو لامکاں کرلیں

مرے دیوانے دل کو آج وہ سمجھانے والے ہیں
اسی سے اپنے دل کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالے ہیں

درد تسکین وہ عاشقِ دلگیر تو ہو
دل کے سمجھانے کو دل میں خلش تیر تو ہو

یہاں جو آیا وہ دُنیا سے دور ہوتا ہے
تمہارے قرب میں اتنا ضرور ہوتا ہے

فلک اور وہ فلک جو چھا گیا گور غریباں پر
ستم اور وہ ستم ڈھاتا ہے جو اب بھی مری جاں پر
اسیر بے گنہ کی آہ کی تاثیر دیکھو گے
فلک بجلی گرائے گا در و دیوار زنداں پر
ہمارے پاؤں کے چھالوں کے یہ ٹکڑے کہاں ملتے
حشم احسان ہے اپنا سر خار بیاباں پر

---

(۴۰) اَوج رائے راج بلی، المتخلص بہ اوؔج، کالیستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے، علمی مذاق نہایت عمدہ تھا۔ نظام کالج حیدرآباد کے پہلے دور کے طالب علم تھے، فارسی اور سنسکرت میں بہت اچھی مہارت تھی۔
اوؔج کے اجداد کا وطن لکھنؤ تھا۔ ان کے والد نے حیدرآباد آکر بود و باش اختیار کر لی تھی اور راجہ شیوراج (جو حیدرآباد کے امیر کالیستھ گھرانے) کے خاندان میں رشتۂ ازدواج کر لیا تھا۔ اوؔج کا کلام مکان کی چھت گر پڑنے سے برباد اور ضایع ہو گیا۔

(۴۱) انوؔر مہابلی، انور تخلص، اوؔج کے بھائی تھے۔ شاعری میں بڑی اچھی مہارت تھی۔ شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ کیونکہ دادا باپ، بھائی سب ہی شاعر تھے۔

(۴۲) وردؔ رگھناتھ راؤ نام اور وردؔ تخلص تھا۔ اسی دور کے شاعر اور افسانہ نگار تھے۔ ان کے حالات نثر نگاری میں بصراحت لکھے گئے ہیں۔ شاعری سے دلچسپی تھی نظم نگاری اور غزل گوئی میں پوری مہارت حاصل تھی۔

(۴۳) شاد اب ہم اس دور کے ایک مشہور شاعر کا تذکرہ کرتے ہیں جو شاد تخلص سے موسوم تھے۔ کشن پرشاد نام۔ راجہ راجایاں مہاراجہ یمین السلطنت خطاب تھا۔ آپ کے والد راجہ ہری کشن بہادر راجہ نرندر پرشاد کے داماد تھے اور راجہ نرندر پرشاد مہاراجہ چندو لال کے پوتے تھے۔

سنہ ۱۸۶۴ء میں شاد کی ولادت حیدرآباد میں ہوئی، ۱۲۸۰ھ چونکہ مہاراجہ نرندر پرشاد کو اولاد ذکور نہیں تھی اس لئے شاد کی پرورشی نانا کے زیر نگرانی ہوئی۔ اوس وقت کے رواج کے مطابق۔ عربی، فارسی، اردو، انگریزی میں دستگاہ پیدا کی۔ خوشنویسی میں بھی پوری مہارت حاصل تھی شعر و سخن کا ملکہ ورثہ میں ملا تھا۔ داغ سے تلمذ حاصل کیا۔ اردو، فارسی شاعری سے شغف تھا۔ آپ کے یہاں راجہ چندو لال کی طرح اکثر مشاعرے ہوتے تھے اس کے علاوہ آپ کے گرد و پیش ہمیشہ شعراء کا جمگھٹا رہا کرتا جن میں ظہیر دہلوی، سرشار لکھنوی، جلیل، فانی، جوش، ہوش، بیگم، ضیاد، محوی۔ صغیری، فرحت، عالم، الم، وحید، واصفی، حسرت وغیرہ قابل تذکرہ ہیں۔

سنہ ۱۳۰۵ھ کو مہاراجہ کشن پرشاد کو ان کی موروثی خدمت پیشکاری کے ساتھ وزیر فوج کا عہدہ ملا، اس کے بعد سنہ ۱۳۱۹ھ میں خدمت مدار المہامی یعنے وزیر اعظم بنائے گئے۔ دس سال کے بعد میر عثمان علیخاں کی مسند نشینی کے بعد اس خدمت سے سبکدوشی حاصل کی مگر اس کے بعد دوبارہ سنہ ۱۳۴۵ ہجری میں صدر اعظم (چیف منسٹر) مقرر ہوئے۔ اب گیارہ سال تک اس خدمت کو انجام دے کر بوجہ پیرانہ سالی کنارہ کش ہوئے۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں (۷۷) سال ۱۳۵۹ھ کی عمر میں اس جہان فانی سے کوچ فرمایا۔

مہاراجہ کشن پرشاد، خوش اخلاق، ذی مروت، داد و دہش میں مشہور تھے۔ مشرقی تہذیب کا آپ آخری نمونہ تھے۔ مطالعۂ کتب کا بڑا شوق تھا۔ لاکھوں کی جاگیر کے مالک تھے مگر ہمیشہ قرض دار رہے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے آپ کو اُردو اور فارسی شاعری میں کامل دستگاہ حاصل تھی، نظم اور نثر پر پورا عبور تھا۔ آپکی تصانیف کی تعداد جو نظم و نثر پر مشتمل ہیں (۶۷) ہے۔ ان میں ناول، سفرنامے۔ نظموں کے مجموعے سب ہی شامل ہیں۔ جملہ اصناف شاعری میں آپ طبع آزمائی فرماتے تھے۔ تصوف آپ کا خاص موضوع تھا۔ آپ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ جب شعر کہنا شروع کرتے تو سینکڑوں اشعار موزوں کر دیتے تھے۔ شاعری کا بڑا حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ اور ان میں یا تو وہی عشق و عاشقی، شاہد اور ساقی کی داستان ہے یا پھر توحید و تصوف سے متعلق ہے۔ نعت، منقبت اور خواجہ اجمیری رح کی مدح میں بھی اونھوں نے اپنے زور قلم کا اظہار کیا ہے۔ ان کو اپنے بادشاہ سے بھی دلی عقیدت تھی اور اس عقیدت کو اونھوں نے شاعری کے ذریعے بھی ظاہر کیا ہے۔

ایک زمانہ تک پنڈت رتن ناتھ سرشار آپ کے یہاں ملازم تھے۔ ان کی نگرانی میں رسالہ "دبدبۂ آصفی" اور "محبوب الکلام" شایع ہوتا رہا۔ شاد کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

چشم وحدت سے دیکھتا ہوں جدہر ۔۔۔ نظر آتا ہے تو ہی تو مجھ کو

مثل پروانے کے جل جائے مگر اُف نہ کرے
عشق میں نالہ و فریاد کا دستور نہیں

وہ ولولہ نہیں وطبیعت نہیں رہی پیری میں یاد آتا ہے عالم شباب کا

قیامت یوں بپا کی ہے انھوں نے آج محفل میں
مرے پہلو سے اُٹھ کر متصل دشمن کے بیٹھے ہیں

بقا کہتے ہیں کس کو موت سے پہلے ہی مرجانا بقا ہے نام کس کا اپنی ہستی سے گذر جانا

حق میں اب عاشق کے دیکھیں فیصلہ ہوتا ہے کیا
عشق کا دعویٰ، حضور حُسن تو باطل نہیں

مضمر ہے بقا، ہستیٔ عالم کی فنا میں
اک جلوۂ وحدت بھی ہے کثرت کی فضا میں

گزرتے ہیں جی سے گذر جانے والے
بہت یاد آتے ہیں مرجانے والے

دیر و کعبے میں گئے اور کبھی بتخانے میں کبھی پابند رہے شادؔ اور آزاد کبھی

مومن جو نہیں ہوں تو میں کافر بھی نہیں شادؔ اس رمز سے آگاہ ہیں سلطانِ مدینہ

پیمبروں میں کوئی ایسا آفتاب نہیں حضورِ احمدِ مختار کا جواب نہیں

عاشق ہوں مجھے جنتِ فردوس سے کیا کام
ہے سر میں ازل سے مرے سودائے مدینہ
کافر نہ کہو شاد کو ہے عارف وصوفی
شیدائے محمد ہے وہ شیدائے مدینہ

مثنوی کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

اللہ کی حمد لکھ رہا ہوں
مدح رسول کر رہا ہوں
عاشق ہوں دل سے پنجتن کا
وصاف حسین اور حسن کا
ساقی پلا شراب توحید
ہو جائے ہمارے گھر میں بھی عید
یاروں کو ہے خواہش صبوحی
صدقے ترے فداک روحی
حاصل ہے آج جہاں کی شادی
کردو ہر شہر میں منادی
ضرغام دکن سکندر اقبال
تنتیسواں ۳۳ آج ان کا ہے سال
راحت کے ہیں بجتے شادیانے
کیا دن یہ دکھائے ہیں خدا نے
تابندہ ہے ہر آصفی آج
لیتے ہیں شہانِ ہند سے باج
ظلِ سبحانی ہے نام ان کا
اور عدل دسخا ہے کام ان کا

(رباعی)

پانی جو برس رہا ہے یہ رحمت ہے
کیا شان ہے معبود کی کیا یہ قدرت ہے
دھوتا ہے گنہ گاروں کے سارے اعمال
یہ بندہ نوازی ہے عجب حکمت ہے

جیسا کہ قبل ازیں تذکرہ کیا گیا ہے کہ مہاراجہ کو تصوف سے خاصہ لگاؤ تھا آپکا کلام تصوف سے مملو ہے۔ چند شعر یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

میں آئینہ ہوں نظر مجھ سے جو ملاتا ہے
وہ جیسا آپ ہے ایسا ہی مجھ کو پاتا ہے

مجھے تو کام ہے اس سے جہاں رہے نہ رہے
زمیں رہے نہ رہے آسماں رہے نہ رہے

نہ ہندو اور نہ مسلم نہ مومن و کافر
ہیں ایک صانع قدرت کی صورتیں ظاہر

اک آواز شکست دل ہوں
نغمہ ساز شکست دل ہوں
باغ میں گل ہوں گل میں بو ہوں
خندۂ جام و جوشش سبو ہوں
نقش طلسم جذب و فنا ہوں
اصل بقا ہوں شکل فنا ہوں
سوز کہیں ہوں ساز کہیں ہوں
راز کہیں، ہمراز کہیں ہوں
گیتی کی آبادی میں ہوں
ہستی کی آزادی میں ہوں
ہستی میری شان خدا ہے
روح میری قربان خدا ہے
میں ہوں شہود سر حقیقت
رہرو مبدائے طریقت

حضرت داغ کے رنگ میں چند شعر ملاحظہ ہوں
وصل کی شب میں نے چھیڑا تو کہا
یہ تیری طرز شتاب اچھی نہیں

قیامت یوں بپا کی ہے انھوں نے آج محفل میں
میرے پہلو سے اٹھ کر متصل دشمن کے بیٹھے ہیں
کسی کی شامت آئے گی کسی کی جان جائے گی
بنا کر صبح سے زلفوں کو وہ بن ٹھن کے بیٹھے ہیں

آنکھ میں سرمہ لگائے آتے ہیں وہ بہر قتل
رنگ نیلا ہو رہا ہے جوہر شمشیر کا

مرثیہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ظلم کیا کیا نہ سہے صبر نہ چھوڑا شہ نے — راہ سے حق کے ذرا منہ کو نہ موڑا شہ نے
حق کا رشتہ کبھی باطل سے نہ جوڑا شہ نے — حق تو یہ ہے کہ کفر کو توڑا شہ نے

گھوڑے کی تعریف

اللہ رے راہوار کی وہ جست و خیز
بند تھی بھاگنے والوں کے لیئے راہ گریز
دیکھتے سرعت کے کرشمے کوئی ہنگام ستیز
قصد راکب کا کیا کرتا ہے کار مہمیز[۱]

اس دور کے کئی اور شعراء کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً جہانگی چند آشفتہ تخلص۔ منشی شیو پرشاد جاہ تخلص۔ پرمیشری پرشاد صولت تخلص۔ ششنکر پرشاد صدق،

---

[۱] مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر جلد ۶۳ شمارہ ۲۔

جانکی پرشاد عشرت، دیبی پرشاد قدر، جوالا پرشاد فاضل وغیرہ مگر افسوس کہ ان کے حالات اور کلام دستیاب نہیں ہوا۔

صفحات گزشتہ میں چھٹے دور کے شعرا کا کلام پیش کر دیا گیا ہے اس دور کے کئی شعراء ساتویں دور میں بھی موجود ہیں۔

چونکہ اس دور میں عام طور سے غزل گوئی کا رواج تھا اس لئے اسی صنف کا کلام زیادہ ہمدست ہوتا ہے، شمالی ہند میں مولانا حالی اور محمد حسین آزاد کی وجہ سے نظم نگاری کا رواج ہو گیا تھا اس کا اثر حیدرآباد میں بھی ہوا۔ سید رضی الدین حسن کیفی اس کے علم بردار تصور کئے جاتے ہیں۔ ہندو اصحاب نے بھی نظم نگاری کی طرف توجہ کی خصوصاً مہاراجہ کشن پرشاد کی نظمیں کئی وجوہ سے قابل قدر ہیں اسی طرح دوسرے شعراء کا کلام بھی فن شاعری کے لحاظ سے قابل ستائش تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ شعراء دہلی اور لکھنو کی وجہ سے جو شاعری کے جدید اسکول کا آغاز ہوا اسکی ترقی ہوئی اور یہاں کی شاعری میں جو انقلاب ہوا اس سے شعر گوئی کے ایک نئے اسکول کی جدید تعمیر ہوئی، غزل گوئی کے ساتھ نظم نگاری کی بنیاد قائم ہو گئی، "دکن اسکول" کی شاعری جو دہلی اور لکھنو کی خوبیوں سے مرکب تھی وجود میں آئی۔

ساتواں دور

۱۹۱۸ء ۱۳۳۶ھ تا ۱۹۵۵ء ۱۳۷۵ھ

ساتواں دور جامعہ عثمانیہ کے منشور خسروی (رائل چارٹر) سے شمار کیا جاتا ہے، اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کے باعث ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور فرزندان دکن نے زیادہ سے زیادہ اس یونیورسٹی کی جانب توجہ کی۔ پورے ملک میں عام طور سے یونیورسٹی کی اردو تعلیم کا شوق دامن گیر ہوگیا، یہ ایک حقیقت ہے کہ اس جامعہ سے استفادہ کرنے والوں میں ہندو طلبہ کی تعداد ہی زیادہ ہے۔ البتہ لٹریچر سے زیادہ انھوں نے سائنس اور دیگر فنوں کی طرف توجہ کی۔

اس دور کے ایک تو وہ شعرا ہیں جو جامعہ عثمانیہ سے تعلق نہیں رکھتے اور دوسرے وہ شعرا ہیں جو جامعہ عثمانیہ کی پیداوار ہیں۔ ہم پہلے اُن شعراء کو پیش کرتے ہیں جن کو جامعہ عثمانیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان میں سے بعض شعراء ایسے بھی ہیں جن کی شاعری کا آغاز اگرچہ چھٹے دور میں ہو چکا تھا مگر اس دور میں ان کی شاعری پختہ ہوئی ہے۔

(۱) آزاد گور سرن بلی نام اور آزاد تخلص۔ کایستھ قوم کے ایک ممتاز شاعر ہیں، ان کے باپ ادج، چچا انور کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں

ہو چکا ہے۔ آزاد کے دادا توکل بھی فارسی کے اچھے شاعر تھے، آزاد کا خاندان اودھ سے تعلق رکھتا ہے۔ توکل پہلے شخص تھے جو حیدرآباد آکر بس گئے۔ راجا اندرجیت کے خاندان میں رشتۂ ازدواج قائم ہوا اور آپ کی اولاد یہاں ہی پیدا ہوئی۔

آزاد کو شاعری گویا ورثے میں ملی ہے، اولاً یہ ختم سے اصلاح سخن لیتے رہے اس کے بعد ضامن کنتوری کے شاگرد بنے۔ آزاد کے متعلق ان کے استاد ضامن کی رائے قابل ملاحظہ ہے :-

"آزاد آزاد ہے، آزاد کا کلام آزاد کے دل کی آواز ہے، عارض نہیں، خال نہیں، گیسو نہیں، کاکل نہیں، لفظی گورکھ دھندا نہیں بیان میں ایچ پیچ نہیں، حقایق کا گنجینہ ہے۔ تعلیم و ہدایت کا آئینہ ہے ...... آزاد کا دل بایں ہمہ آزادی عشق ذات کا پابند ہے، اور ان کے کلام میں اسی عشق کی جھلک نمایاں ہے"

آپ نے رباعیات عمر خیام کا ترجمہ اردو رباعی میں الخیام کے نام سے کیا ہے۔ آزاد کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

ہر ذرۂ کونین ہے گھر ذات خدا کا　　قبلہ ہے مگر نام فقط قبلہ نما کا

پھر نہ پلٹی وہ صدا گنبد دوار سے

نعرۂ منصور، کار ہمت مردانہ تھا

دعوے جنھیں آزاد تھے یاں نام و نشاں کے

عالم میں نظر آتے ہیں بے نام و نشاں آج

زندگی سیلِ حوادث کا بھنور ہے آزاد
سازِ ہستی ہے فقط خوابِ پریشاں اپنا

نہ ممکن نیست سے ہستی نہ ہستی نیست سے ممکن
یہ عالم ہستِ مطلق ہے، چھپا معلول و علت میں

تعلق دو جہاں سے اُٹھ گیا ہو — دمِ آخر لگی ہو لو خدا سے

کہاں تابِ پروازِ روح الامیں میں — ہے عرشِ بریں آشیانہ ہمارا

ممکن نہ تھا کہ چیر کے دکھائیں دل تمھیں — قطرہ لہو کا اک سرِ مژگاں بنا دیا
یہ بھی پھرا ادھر کو جدھر کو نگاہ پھری — دل کو نگاہِ یار نے چوگاں بنا دیا

آئے ہیں ترے در پہ کریں کیا سوال ہم
ہم آپ عرضِ حال ہیں صورتِ سوال ہے

فرشتے تھے کبھی ہیں آج انساں — بتائیں کیا ہوئے ہم کیا ہیں کیا سے

پتلیاں آنکھوں میں ٹھہریں ہو کے محوِ حُسنِ یار
نقشِ حیرت ہو گئیں تصویرِ جاناں دیکھکر

ترجمہ رُباعی خیام۔

آنکھوں میں جو اپنے رہگذر رکھتا ہے
ہر شاہ و گدا اس پہ نظر رکھتا ہے
جویان دریا غواصی اور گوہر خور ہے
اس بات کی تہ کی وہ خبر رکھتا ہے

---

(۲) جذب راگھویندر راؤ نام اور جذب تخلص، تعلقہ عالم پور ضلع رائچور کے رہنے والے ہیں۔ مادری زبان کنڑی ہے۔ مگر اردو سے خاص دلچسپی ہے، فارسی میں بھی مہارت نامہ رکھتے ہیں۔ وکالت کا پیشہ کرتے ہیں، صوفی مشرب ہیں۔ ہندو ویدانت کا خوب مطالعہ کیا ہے۔ سطح تصوف اور ویدانت کو ملاکر رباعی موزوں کرتے ہیں۔ جذب کی رباعیات کے دو تین مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ جذب کے کلام میں اخلاق کی سادگی اور وعظ و نصیحت کی متانت پائی جاتی ہے وہ سنسکرت کے عرفانی خیالات کو اردو میں پیش کرتے ہیں اور ان کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی اور سلاست ہے۔ معمولی سمجھ کا انسان بھی اس سے لطف حاصل کر سکتا ہے۔

کر جاتی ہے تاثیر بروں کی صحبت
یعنے کہ بگڑ جاتی ہے اچھی خصلت

گنگا کا وہ پانی جو ہے میٹھا شربت ملتے ہی سندر میں وہ کھارا[1] ہو گا

---

[1] یعنے کھاری۔

اخلاق کو تن سے ہے اگرچہ نسبت
دونوں میں فرق ہے لیکن حضرت
تن ہے کہ بہت جلد فنا ہوتا ہے
قائم رہتی ہے انتہا تک سیرت

آتی جاتی ہے یوں تو دولت اے یار
دیکھا نہیں اس میں تو سکون اور قرار
گھنگھور گھٹا چھائے اگر گرما میں
کیا اس کا بھروسا کہ وہ برسے ہر بار

جو شئے ملے خواہش کی وہی ثروت ہے
پیسہ جو ملے غریب کو نعمت ہے
عارف جو حقیقت میں ہے اسکے نزدیک
افلاس کا ہونا ہی بڑی دولت ہے

اے جذب مسرت و مصیبت اکثر
آتیں ہیں نہیں جو ہیں بزرگ و برتر
دیکھو کہ ہے چاند کو عروج و زوال
تارے ان سے بری ہیں اے اہل ہنر

جذب کی غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

شیفتہ ہوں جو یار جانی کا
یہ خلاصہ ہے زندگانی کا

پاؤں چلنے سے ہو گئے عاجز
اب یہ ہے زور ناتوانی کا

پاس رسوائی کا نہیں دم بھر
کس قدر قہر ہے جوانی کا

وہ سمجھتے ہیں دوست کو دشمن
کچھ ٹھکانہ ہے بدگمانی کا

سخت مضطر ہوں کچھ نہیں کہتا
جب سے خوگر ہوں بے زبانی کا

رنج و حرماں ہی پاس ہے غم ہے
کس کو ہے شوق زندگانی کا

جذب ہر ایک شعر ہے تصویر
فکر اپنی خیال جانی کا

---

(۳) عالی

راجہ نرسنگھ راج بہادر، عالی تخلص، گردھاری پرشاد باقی کے فرزند ہیں، ۱۳۱۱ھ میں تولد ہوئے۔ باپ کا سایہ نہایت صغیر سنی میں اُٹھ گیا۔ مرحوم اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں نے ان پر خاص نظر عنایت مبذول فرمائی۔ باپ کی جملہ خدمات سے اُن کو سرفراز کیا سررشتہ ہپہ کی ہتممی سے وظیفہ حاصل کیا۔ اس سال دنیا سے چل بسے۔

شاعری کا شوق باپ سے ورثہ میں ملا ہے۔ حضرت جلیل سے تلمذ۔ مہاراجہ یمین السلطنت کے مشاعروں میں ہمیشہ شریک رہے اور مہاراجہ کے مصاحب بھی تھے، اب یادگار شاد میں جو مشاعرہ ہوتا ہے وہ انھیں کی نگرانی اور انھیں کے اہتمام سے ہوتا ہے، کلام کا نمونہ پیش ہے۔"

کون ہمدرد ہو پھر جب نہ ہوا اپنا اپنا
غیر ممکن ہے کہ ہو جائے پرایا اپنا

سر بھی سودائے محبت میں دیا جان بھی دی
کس گرانی سے ہوا دیکھئے سودا اپنا
وہ گھڑی کیسی مبارک تھی خدا پھر لائے
روٹھنا اُن کا شب وصل منانا اپنا

نہیں بھاتی ہیں دور کی باتیں
سنو موسیٰ سے طور کی باتیں
تجھ کو زیبا ہے اور سنا بھی ہیں
اے جوانی، قصور کی باتیں
تلملانا تڑپنا جاں دینا
ہیں دل ناصبور کی باتیں
بت خدا بن گئے معاذ اللہ
نہیں اچھی غرور کی باتیں
زاہد خشک کچھ سنا ہی کر
ہم سنیں گے سرور کی باتیں

ایک دیوانہ تھا جو آپ کے گھر سے نکلا
کچھ خبر بھی ہے کہ تھا کون کدھر سے نکلا
جس کا ہو تم ہے خدا اسکے سبھی ہوتے ہیں
یہ نہ سمجھو کہ کوئی کام بشر سے نکلا
اس رقابت کے میں قربان کے مرتے دم تک
تیر قاتل کا نہ دل سے نہ جگر سے نکلا
سب گنہ بھول گیا اک اسی امید پر
کوئی مایوس نہ اللہ کے گھر سے نکلا
خاکساری سے ہوا کام وہ اپنا عاکی
اہل دنیا کا نہ جو سیم سے زر سے نکلا

کون کہتا ہے کہ تو خوگر بیداد نہیں   مجھ میں پہلی سی مگر طاقت فریاد نہیں

تیر نظر جو چلتے ہیں تیغ ادا کے بعد   کیا لوگے امتحان وفا پھر جفا کے بعد

رفتہ رفتہ باعثِ تسکیں ہوئیں بے تابیاں
دردِ دل اتنا بڑھا بڑھ کر دوا ہو گیا

قہر ہے نظارۂ خوباں بشر کے واسطے   ہاں کلیجہ چاہئے تیر نظر کے واسطے

بے رخی، بے وفائی، بد عہدی   تو نے سیکھی ہے کیا جوانی سے

رُباعی

پوشیدہ ہے، گو جلوہ عیاں تیرا ہے
کثرت ہو کہ وحدت ہو نشاں تیرا ہے
کس کے دل میں نہیں ہے تیرا مسکن
کس کے لب پہ نہیں بیاں تیرا ہے

---

(۴) محبُوب

محبُوب راج، المتخلص بہ محبُوب، گردھاری پرشاد کے فرزند اور عالی کے بھائی تھے۔ سنہ ۱۳۱۲ھ میں تولد ہوئے اور سنہ ۱۳۵۰ھ میں انتقال ہوا۔ محبُوب کی ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ میں ہوئی۔ اس کے بعد خانگی طور پر پنجاب میٹرک کا امتحان دیا۔ ان کو سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا

ہر سال کہیں نہ کہیں جایا کرتے۔

شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ اولاً شاد کو کلام سنایا کرتے تھے، پھر جلیل کے شاگرد ہوئے، مہاراجہ کشن پرشاد کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے، کلام کا نمونہ پیش ہے۔

اپنے اعمال کی خرابی کو ہم نے گردن جھکا کے دیکھ لیا

اللہ رے درازیٔ شبِ ہجر ملتی ہی نہیں خبر سحر کی

آفت ہیں ادائیں فتنہ گر کی کچھ خبر نہیں دل و جگر کی

سمجھ کے دل کو لگانا کسی حسین سے تم نہ مول بیٹھے بٹھائے یہ دردِ سر لینا

ستم کا دیکھ کر انداز ہوتی ہے خوشی سب کو
کہ ہم بھی چاہنے والوں میں شامل ہوتے جاتے ہیں

بہار آئی ہے جب سے تیرے مستوں کی یہ حالت ہے
پڑی ہے جان شیشے میں لگی ہے آنکھ ساغر سے

جاں بلب شوقِ شہادت میں تھے ہم
تیغ قاتل کی مسیحا ہو گئی

---

(۵) اصغر راجیشور راؤ نام، اصغر تخلص، سمستان دوم کنڈہ کے راجہ تھے۔ ان کی مادری زبان تلنگی تھی، لیکن فارسی اور اردو کا خاص ذوق تھا، تصنیف وتالیف سے دلچسپی تھی، تقریباً تین درجن کتابیں مختلف فنوں کی شائع فرمائی ہیں۔ جملہ کتابیں نثر میں ہیں وہ اپنی شاعری کو پوشیدہ رکھنے کے عادی تھے۔

(۶) مدن مدن موہن، ایک نوجوان تعلیم یافتہ شاعر ہیں۔ نظم اور گیت موزوں کرتے ہیں۔

سب سے اچھا دیس ہمارا کل نگروں سے پیارا ہے
اپنے تن من دھن سے بڑھ کر دھن دیس ہمارا ہے
سندر نیچے اونچے پربت، امرجل ندیاں اس کی
بھرے دہاں کا کھیت سہانا اپنے کرن کا سہارا ہے[۱]

---

(۷) ناظر پاپالال نام، ناظر تخلص، راجہ گردھاری پرشاد کے نواسے ہیں۔ ان کو شاعری گویا ورثے میں ملی ہے، ثاقب لکھنوی سے تلمذ حاصل ہے۔

کئی دن سے نہیں ملتا ہے دل — نہیں معلوم کس نے لے لیا دل
ہوئے جب غیر سے گرم سخن وہ — بھڑک اٹھا کلیجا پھنک گیا دل
یہ سودا کس کی الفت کا ہوا ہے — بکا جاتا ہے بے داموں مرا دل

جو چاہو ظلم کر لو ہم پہ صاحب — شکایت تو کریں گے ہم تمہیں سے

---

[۱] سخنوران دکن ص ۳۳

الہٰی تخت آصف رکھ تو قائم　　　دعا یہ مانگتا ہوں شاہ دیں سے

---

(۸) رہبر

حکیم ست گرو پرشاد صاحب، رہبر تخلص ۱۳۱۷ھ میں حیدرآباد میں تولد ہوئے۔ میٹرک کا امتحان دیکر حکمت کی جانب توجہ کی اور فن طب میں مہارت پیدا کرلی، شعروشاعری کا ادبی ذوق ورثہ میں ملا ہے۔ سید علی احمد زیرک کے شاگرد ہیں۔ زیرک کو نادر علی برتر سے تلمذ تھا۔ رہبر کو فن شعر میں بڑی اچھی دستگاہ حاصل ہے۔ زبان اور بیان پر پوری قدرت موجود ہے۔ کلام صاف ہوتا ہے۔

تفوق خاکساری کے سوا حاصل نہیں ہوتا
بلندی پہ پہنچنے کا ذریعہ تو پستی ہے

نرالا ہے عجب قاعدہ بازار الفت کا
گراں جنس وفا ہے تو متاع جور سستی ہے

ہیں عاصی اس کے مستحق واعظ سر محشر
گنہگاروں پہ ہی اللہ کی رحمت برستی ہے

لطف کا کیا ذکر اب تو جور سے محروم ہے
کتنا ناکام تمنا یہ دل مغموم ہے

درد کی لذت کوئی بے درد کیا جانے بھلا
آشنائے نعمت غم وہ ہے جو مغموم ہے

کیا کروں قاصد کہ ترک وضع ہے ترک پیام
جو جواب آئے گا اس کا وہ مجھے معلوم ہے

اس تجاہل کے تصدق پوچھتے ہیں سب سے وہ
عرصۂ محشر میں یہ کیا شور کیسی دھوم ہے
زمزم و تسنیم، کوثر پائیں گے بادہ پرست
زاہد بد ذوق ان چیزوں سے تو محروم ہے
حشر میں ان کی خجل نظروں نے رہبر کیا کیا
نطق کے جوہر سے اب میری زباں محروم ہے[۱]

(۹) پنڈت ونشی دھر

پنڈت ونشی دھر صاحب سنہ ۱۹۰۱ء میں کوئٹہ میں تولد ہوئے۔ گورکل یونیورسٹی سے "دویالنکار" کا اعلیٰ امتحان پاس کیا، بچپن سے شعر گوئی کا شوق رہا۔ نظم کہتے رہے اور انعام بھی پایا۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں اورنگ آباد کالج میں لکچرار رہنے پھر حیدرآباد آکر جامعہ عثمانیہ میں ہندی کے صدر رہے نظم کے دو مجموعے "بیرے پھول" اور "دیوبند" شایع ہو چکے ہیں، ہندی اور اردو کے رسالوں میں آپ کا کلام اور اردو مضامین شایع ہوئے ہیں۔ حضرت اکبر وغیرہ پر آپ نے بڑی اچھی ریسرچ کی ہے۔ حیدرآباد کے مختلف علمی جلسوں اور اور مشاعروں میں شریک ہوتے اور اپنا کلام سناتے ہیں۔ ونشی دھر صاحب کی نظمیں اور گیت بلند معیار کی حامل ہوتی ہیں ان میں رفعت خیالی، پرواز تخیل، صفائی اور سادگی کے ساتھ اثر بھی پایا جاتا ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے

جیون چکر

یہ جگ ہرا بھرا رہتا ہے
چاہے کچھ ہو جیوں کا یہ چکر سدا چلتا رہتا ہے

---

[۱] رسالہ ایوان سالنامہ سنہ ۱۹۵۱ء ص ۲۴۹

کتنے پتے جھڑ جاتے ہیں کتنے پھول بکھر جاتے ہیں
پھر بھی نو پھول پتیوں سے بن ہنستا کھلتا رہتا ہے
جتنا جل آگے جاتا ہے اتنا ہی پیچھے آتا ہے
یوں ہی سرنیا میں پانی سردت سدا بہتا رہتا ہے
جیسا کل تھا اب ویسا ہے، کل بھی ہوگا اب جیسا ہے
سدا پرانا ہو کر یہ جگ نت نیا بنتا رہتا ہے
کبھی چاندنی کبھی اندھیرا کبھی رات ہے کبھی سویرا
اوپر نیچے ہو کر پہیا آگے کو بڑھتا رہتا ہے

شمع اور پروانہ

تم کہتے ہو تم مت آؤ، میں کہتا ہوں میں آؤنگا
یہ جلنا ہے کچھ کھیل نہیں، جلنا میں کھیل بناؤنگا
تم کہتے ہو جلنے میں تو جو کچھ ہے کھونا پڑتا ہے
میں اس کھونے سے سونے کا جگ مگ سنسار بناؤنگا
یہ تو جیون کا سودا ہے جو ایک بار ہی ہوتا ہے
جلنا پرکاش کی قسمت ہے جلکر پرکاش بن جاؤنگا
آخر جلنے میں کچھ تو ہے جو تم ہنستے ہنستے جلتے ہو
میں ساتھ تمہارے ہنس ہنس کر جلنے کا لطف اٹھاؤنگا
چھوٹے سے تربل پنکھو پر اپنے کو لادے پھرتا ہوں
یہ سارے بوجھ تمہیں دے کر اپنے سے چھٹی پاؤنگا
تم کہتے ہو تم مت آؤ، میں کہتا ہوں میں آؤنگا

(۱۶) کرن

راجہ کرن پرشاد، کرن تخلص، مہاراجہ کشن پرشاد کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ راجہ کندن لال کے اکلوتے فرزند ہیں۔ مدرسہ عالیہ اور نظام کالج میں تعلیم پائی، شاعری کا شوق گویا ورثہ میں ملا ہے۔ مہاراجہ چندولال اور مہاراجہ کشن پرشاد جیسے شعرا آپ کے خاندان میں گزرے ہیں۔ علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی، سید جمال الدین جیسے استادوں سے آپ نے تعلیم پائی شاعری میں بھی ان سے اصلاح لیتے رہے۔ آپ کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ کرن کے نام سے شایع ہو گیا ہے۔ اس میں آپ کے خود نوشتہ حالات زندگی بھی شامل ہیں۔ نظم اور غزل دونوں کی مشق ہے۔ کبھی مزاحیہ کلام بھی موزوں کرتے ہیں۔ کلام سادہ اور شگفتہ ہوتا ہے، خیالات میں پاکیزگی اور لطافت موجود ہے۔

پیامبر کی بھی کوشش نہ کام کچھ آئی
انھیں جو لائیں ادھر لائیں گے مرے آنسو

ہٹا ہی لیں گے وہ آغوش سے سر میرے ضرور
ڈھلک کے پلکوں پہ گر آئیں گے مرے آنسو

آزاد ہو کے بندۂ حرص و ہوا ہیں ہم
اپنے ہی دل سے پوچھتے آخر کو کیا ہیں ہم
الفت کی کیا بتاؤ یہی ہیں نشانیاں
کہنے کو بھائی بھائی مگر بے وفا ہیں ہم

جھانک کر پردے سے یہ کیا کر دیا
دل میں میرے حشر برپا کر دیا
دیدۂ تر میں تھا پنہاں راز عشق
اشک کے قطروں نے افشا کر دیا
پیتے تھے چھپ چھپ کے جام سرخ ہم
آنکھ کی سرخی نے رسوا کر دیا
وہ سنورتے ہی رہے شب بھر کرن
آتے آتے ہی سویرا کر دیا

چھپا کر رکھدیا جام و سبُو کو   یہ سوجھی اس کو ایسی دل لگی کیوں

ساغر جھلک رہا ہو ہر اک راگنی کے ساتھ
پہلو میں تو ہو اور چمن میں بہار ہو
واعظ نصیحتوں کا سماں اب گزر گیا
وہ چاہئے بشر جو میرا غمگسار ہو

تمہارے چاہنے والے بہت ہیں جانتا ہوں
ہیں ان میں کتنے مگر جاں نثار دیکھ تو لوں

ایک نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

سہانا ہے سماں کلیاں چمن کی مُسکراتی ہیں
گلے سے ڈالیاں اک دوسرے کے ملتی جاتی ہیں
روش پر سبزہ و گل بھی ہوا میں رقص کرتے ہیں
اُٹھائے چوٹیاں سر کی کہیں بلبل چہکتے ہیں
گلاب اور موتیا اور سیوتی آتے ہیں جوبن پر
کنول پہ دوڑتا بھونرا ہے دیکھو مست بن بن کر
کہیں بیلا چنبیلی جھومتی ہے شاد ہو ہو کر
کھلے گی رات کی رانی ذرا آرام سے سو کر
گُڈہل کے پھول جھکے بن کے شاخوں پر لٹکتے ہیں
کہیں سورج مکھی خورشید کی صورت کو تکتے ہیں

خوشی سے گر کہیں لالہ نہیں پھولے سماتے ہیں
کہیں دو دنا کہیں مردا کہیں چمپا جھکتے ہیں
قطاریں سرو کی خاموش ہیں کس فکر میں آخر
چمن والوں کو ان سے کیا شکایت ہے سنیں آخر
چمن میں رہتے ہیں اور اپنے کو بیگانہ کہتے ہیں
جو غنچے مسکراتے ہیں انہیں دیوانہ کہتے ہیں

---

(۱۱) وہمی

حکیم دلیسرائے نام وہمی تخلص۔ آپ ڈاکٹر کرپا شنکر حشم کے اکلوتے فرزند ہیں ذیقعدہ ۱۳۰۸ھ کو تولد ہوئے گھر کی اردو فارسی تعلیم کے بعد سٹی ہائی اسکول میں شرکت کی اور میٹرک تک تعلیم پائی۔ پھر مدرسہ طبیہ یونانی سرکار آصفیہ میں شرکت کی اور حکمت کا امتحان کامیاب کیا پہلے سرکاری دواخانوں میں مامور ہوئے۔ اس کے بعد اپنا خانگی مطب جاری کیا اور اب تک جاری ہے۔ حکومت آصفیہ نے ایک سو روپیئے کی امداد آپ کے مطلب کو جاری کی تھی۔ مگر حکومت حیدرآباد نے بند کر دیا۔ اپنے والد کی طرح آپ بھی عوام کا مفت علاج کرتے ہیں۔ دور دور سے مریض آتے اور اکثر شفا پاکر جاتے ہیں۔

اپنے خاندانی روایات کے مطابق شعر و سخن سے دلچسپی ہے۔ نادر علی برتر مرحوم سے تلمذ حاصل تھا۔ تغزل میں آپ کا خاص رنگ ہے اردو میں بہ پابندی قافیہ تلسی کرت راماین کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب عنقریب طبع ہونے والی ہے وہمی کا کلام اکثر مشاعروں میں داد تحسین حاصل کرتا ہے۔ غزل اور نظم دونوں موزوں کرتے ہیں

کلام کا نمونہ پیش ہے۔

خدا پر ہو نظر جنکی قناعت جن کا پیشہ ہو
خدا کو ہیں وہی پیارے وہی منظور ہوتے ہیں

مفت ملتی ہے تو کعبہ میں بھی واعظ پی لیں
لاکھ نفرت ہو اُنھیں بادہ سے میخانے سے

تم کو نیرنگیٔ دنیا پہ تعجب کیوں ہے
کبھی کمزور بھی ہو جاتے ہیں طاقت والے

وہ ہے شمشیر جوہر دار، یہ ہے شمشیر بے جوہر
نمایاں ہے جہاں میں فرق جاہل اور کامل کا

درویش کو کب چاہئے کمخواب و مشجر
کمّل ہی اُسے خوب ہے ملبوس شہی سے

حد سے بڑھ جاتا ہے جب سوزِ جنونِ الفت
شمع کی آگ نظر آتی ہے پروانوں میں

بے پردگی نے پردہ حیا کا اُٹھا دیا
اب خال خال رہ گئے پردہ نشیں کہیں

ہمیشہ زندگی کٹتی ہے اپنی خوش جمالوں میں
گدائے حسن ہیں او مست ہیں اپنے خیالوں میں

غنچے چٹک کے کہتے ہیں فصلِ بہار میں
رکھا ہے خاک زندگیِ مستعار میں

زبانوں میں زباں ہے یہ بلاغت پوچھتے کیا ہو
ادب آموز اُردو کی فصاحت پوچھتے کیا ہو

آج ہی دام سے پائی ہے رہائی میں نے
آج ہی موسمِ گل صحنِ گلستاں سے چلا

ہے میکدوں میں بھی اتنا شراب کا اب کال
کہ ڈھونڈتے ہیں تو ملتی نہیں دوا کے لئے

کرو جو غور تو دونوں ہیں لازم و ملزوم
بقا فنا کے لئے ہے، فنا بقا کے لئے

---

(۱۴) جگناتھ پرشاد صاحب

حیدرآباد کے ایک ممتاز صاحبِ قلم، وکالت آپ کا پیشہ ہے۔ اپنی ایڈیٹری میں ایک اخبار "دکن پنچ" شایع کرتے تھے۔ نظم و نثر دونوں پر قدرت حاصل ہے۔ نظم نگاری اور غزل گوئی پر اچھا دسترس حاصل ہے۔ ادبیات اور ظرافت سے خاص لگاؤ رکھتے ہیں۔

کنہیا کی بانسری

روح کو وجد ہے یارب یہ صدا کیسی ہے
دل ہے بے چین الٰہی یہ بلا کیسی ہے

خلق بیتاب ہے یہ طرفہ ادا کیسی ہے   یہ درا در کی نوا، بانگ درا کیسی ہے

سحر کاری دھن نئے سے دکھاتا ہے کون
اپنے الحان سے دیوانہ بناتا ہے کون

چھا گیا چار طرف عالم امکاں میں سکوت   ہو گئے جن و بشر طیر و بہائم مبہوت
یہ وہی نئے ہے جو ہر جان و رح کا قوت   یوں ہوا نغمہ سرا واقف سر ملکوت

بشنو از نے کہ عجب درد کی روداد ہے یہ
دل میں رہ رہ کے جو تڑپے مائل فریاد ہے یہ

ایک کیفیت عالم ہے یہ گونجی ہے صدا   ساکن دشت و جبل ساکن آب و صحرا
جو جہاں ہے وہیں ساکت ہے نہیں ہوش بجا   آب تھما ہیں نہ جنبش ہے نہ چلتی ہے ہوا

شور افگن ہے یہ نئے شور فزا ہے یہ نئے
اڑ گئے ہوش عجب ہوش ربا ہے یہ نئے

نغمۂ کن کی صدا ہے کہ ہے اور بس وہی   ہے اثر بخش نوا ہے رہبر بھی وہی
ایشور بھی وہی اور رام وہی ہر بھی وہی   ہے وہی آدم ہے اللہ اکبر بھی وہی

جلوۂ دہر بھی ہے شمع سر طور بھی ہے
دل سے نزدیک بھی آنکھ سے وہ دور بھی ہے

---

(۱۴۳) خوشتر

رائے کشن سنگھ نام خوشتر تخلص، راج پوت قوم کے سپوت، شاعری کا شوق ہے "دکن پنچ" میں اکثر آپ کا کلام شائع ہوتا رہا۔ مزاحیہ کلام بھی موزوں کرتے ہیں۔

پھر آئینہ رخ اپنا دکھاتا ہے دکن پنچ
حیراں پھر عالم کو بناتا ہے دکن پنچ

رنگ اپنا سر بزم جماتا ہے دکن پنچ
نیرنگ پھر عالم کو دکھاتا ہے دکن پنچ
ہر حرف میں پوشیدہ ہے آثار قیامت
دنیائے ظرافت کو جگاتا ہے دکن پنچ
پھر صفحۂ قرطاس کو گلزار جہاں میں
عبرت دہ گلزار بناتا ہے دکن پنچ
سرمست جو ہے بادۂ پندار سے خوشتر
مستانہ صفت جھومتا آتا ہے دکن پنچ

---

(۱۴) عاجز راجہ گورکرن، عاجز تخلص تھا۔ راجہ شیوراج (جو سلطنت آصفیہ کے مشہور کایستھ امیر تھے) کے قریبی عزیز تھے۔ حکومت آصفیہ نے راجہ بہادر کا خطاب عطا کیا تھا۔ شعر گوئی کا شوق تھا۔ حشمؔ سے تلمذ رکھتے تھے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں انتقال ہوا۔

(۱۵) خاور رام چندر پرتاب نام اور خاور تخلص تھا، طبقۂ جاگیردار سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد رائے سورج پرتاب صاحب جاگیردار تھے، رام چندر پرتاب صاحب قانونی امتحان پاس کر کے وکالت کرنے لگے۔ پھر راجہ شیوراج کے اسٹیٹ میں منصفی کی خدمت پر مامور ہوئے۔ شاعری کا شوق تھا۔ حشمؔ کے شاگردوں میں شامل تھے۔

(۱۶) فدوی کملاپت پرتاب صاحب کایستھ قوم کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے والد سورج پرتاب صاحب جاگیردار تھے۔ نظام کالج سے بی اے کی ڈگری اس وقت حاصل کی جبکہ نظام کالج کا تعلق

مدراس یونیورسٹی سے تعلیم سے فارغ ہو کر اولاً معتمدی فینانس میں ملازم ہوئے پھر صدر المہامی پائیگاہ میں منتقل ہوئے، جوانی میں انتقال ہو گیا۔ شاعری کا شوق تھا۔ حشم سے تلمذ رکھتے تھے۔

(۱۷) شارب

منوہر لال نام اور شارب تخلص، حیدرآباد کے ایک کالستھ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے دادا شمبو پرشاد صاحب فارسی کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔

شارب نے فارسی، اردو، ہندی کی تعلیم پائی۔ شاعری کا شوق کم عمری سے ہے۔ اولاً نرسنگ پرشاد صاحب سے تلمذ رہا پھر عبدالباقی صاحب شطاری کے شاگرد رہے۔

غزل اور نظم دونوں کہا کرتے ہیں۔ ہر مکتب خیال کے پلیٹ فارم سے کلام سناتے اور داد تحسین حاصل کرتے ہیں۔ ہر مذہب اور ازم کا مطالعہ کیا ہے مگر شاعری کو کسی ازم سے پابندی نہیں کیا جو محسوس کرتے ہیں لکھتے رہیں۔ نمونہ کلام پیش ہے۔

چمن کا لوٹ کے صبر و قرار گذری ہے بہار دے کے فریب بہار گذری ہے

نہ باد صبح کے جھونکے نہ نور آنکھوں میں
یہ کیسی شب مرے پروردگار گذری ہے

رکھی ہی تھی ابھی بنیاد آشیانے کی
کہ ہم پہ اٹھنے لگیں انگلیاں زمانے کی

یم حیات میں ساحل اسے نصیب کہاں
جسے ملی نہیں توفیق ڈوب جانے کی

یہ بجلیوں کی عنایت ہے آندھیوں کا کرم
سنور رہی ہے جو تقدیر آشیانے کی
مذاقِ زلف نے بخشا مذاقِ دار و رسن
کڑی کہاں سے کہاں ملگئی زمانے کی
غمِ حیات خدا کے لئے نہ ہو ناراض
مجھے تو ہے یونہی عادت سی مسکرانے کی
لنڈھا لنڈھا کے نئی زندگی کے خمِ شراب
فضا ہی آج بدل دو شراب خانے کی

---

(۱۸) بہار ایک اور شاعر جو منوہر لال نام کے ساتھ بہارؔ تخلص کرتے ہیں۔ حیدرآباد آپ کا وطن ہے۔ رائے شاہد لال کے فرزند ۱۹۱۲ء میں تولد ہوئے، اردو، فارسی میں دسترس حاصل ہے اور اکثر مشاعروں میں حصہ لیتے ہیں۔ غزل اور نظم دونوں موزوں کرتے ہیں۔ نظم و نثر دونوں پر عبور حاصل ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

دیکھئے ہوتا ہے کیا اپنا چمن میں انجام
برق نے دیکھ لیا ہے مرے رہنے کا مقام
میں تو پروردہ گرداب تلاطم ہوں دوست
رہنے والوں کو مبارک رہے ساحل کا مقام
انگلیاں اٹھی ہیں جس سمت گذر جاتا ہوں
گردشِ عشق نے کچھ ایسا کیا ہے بدنام
تشنگی بجھتی نہیں اور بھی بڑھ جاتی ہے

اپنی نظروں سے پلا ساقیا تو جام پہ جام
بات دونوں کی اسی کے لئے ہوتی ہے بہار
نام اللہ کا لب پہ ہو کہ ہو نام رام

الٰہی اس چمن پر آگ برسے — چمن والا جہاں پھولوں کو ترسے

ایسے جینے سے تو اب موت ہی دیدے یارب
جینا آتا نہیں غیروں کا سہارا لے کر

رہ حیات میں پھر پھیلنے لگے سائے
فریب صبح ہے یہ صبح کا ظہور نہیں

یہ کیا بہار یہ کیسا ہے میکدہ ساقی
شراب پی تو رہے ہیں مگر سرور نہیں

---

(۱۹) امین ٹھاکر کندن سنگھ نام امین تخلص۔ ایک راج پوت گھرانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جناب مظہر صدیقی سے شرف تلمذ ہے۔

(۲۰) فقیر ٹھاکر بجرنگ سنگھ بیس فقیر تخلص آپ ڈاکٹر ٹھاکر کمند سنگھ بیس کے فرزند ہیں ڈگری کالج کے تعلیم یافتہ ہیں، پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کی سند لی ہے۔ سید محمد ضامن کنتوری سے شرف تلمذ حاصل رہا۔ نظم و نثر دونوں پر عبور

حاصل ہے۔

بقدر ظرف لذت مل رہی ہے ملنے والوں کو
شراب معرفت پی کر جو نکلے بزم عرفاں سے

اجازت ہو تو میں دنیا میں کوثر کی بنا ڈالوں
یہاں بھی اک تمہارے نام کا مے خانہ ہو جائے

کیوں تمنا کیجئے کیوں مشق حسرت کیجئے
ذرہ ذرہ سے نمایاں اسکی صورت کیجئے

مزاج اہل فن ہو کر خیال نکتہ داں ہو کر
رہے انسان دنیا میں بلندی کا نشاں ہو کر

نگاہ شوق کی رگ رگ میں ذوق جستجو بھر لے
جہان دل کے ہر ذرے کو وقف آزاد کر لے

جام مے گلرنگ فقیر اب نہیں ملتا
اس دور میں کانٹوں کی طرح خشک زباں ہوں

سکون قلب کے جویا جگر تابی تو پیدا کر
جمود دل کے اندر روح سیمابی تو پیدا کر

جو پس جاتا ہے سرمہ کی طرح راہ صداقت میں
میسر چشم عالم میں اسے اعزاز ہوتا ہے

بھیج کر معروضہ مدت ہو گئی   کب نظر پڑتی ہے دیکھا چاہیے

---

(۲۱) ساقی

رائے نرہر راج نام اور ساقی تخلص، آپ کے والد راجہ نرسنگھ راج صاحب عالی اور دادا "باقی" کا تذکرہ اوراق ماقبل میں ہو چکا ہے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں ساقی کی ولادت ہوئی، نظام کالج اور پونہ کے زرعی کالج سے ڈگریاں حاصل کیں، خاندانی روایات کے باعث بچپن سے شاعری کا شوق ہے حضرت جلیل کے شاگرد بنے۔ حضرت جلیل کے انتقال کے بعد ان کے جانشین اور فرزند صدیق احمد صاحب ثانی سے اصلاح سخن لیتے ہیں۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

یہ بھی کمال جذبۂ عشق نگار تھا   سمجھا ہر ایک اسکی طرف روئے یار تھا

نہ کر برباد اے ظالم مرے اس خانۂ دل کو
کھلے ہیں گل تمنا کے ہزاروں اس گلستاں میں

جہاں میں انقلاب آئے نہ آئے کیا ہمیں پرواہ
اپنا آشیانہ نخل باغ بے خزاں پر ہے

کیوں بھٹکتا ہے تو اے ساقی کسی کے واسطے
کعبہ تیرے دل میں ہے بتخانہ تیرے دل میں ہے

کیا کہوں کس سے کہوں کس کو سناؤں حال دل
مجھ میں اب طاقت کہاں باقی رہی فریاد کی

میکدے میں بھی رہ کے اے ساقی   پارسا تو ہے میگسار نہیں

کعبے میں چلے جاؤ یا بت خانے میں جاؤ
جز نام خدا اور کوئی نام نہیں ہے

---

(۲۲) رمیش

ٹھاکر رمیش کمار چندیل، رمیش تخلص، ٹھاکر رگھوناتھ سنگھ چندیل کے فرزند ہیں۔ نظام کالج میں تعلیم پائی، فقیر (جن کا تذکرہ کیا گیا ہے) کے شاگرد ہیں۔ نظم کے ساتھ نثر نگاری کی بھی مشق ہے۔

اس دھوپ چھاؤں پہ نہ بھروسہ کرو رمیش
سایہ کی طرح ہے یہ زمانہ شباب کا

روایاتِ کہن کی یاد بھی دل میں نہیں باقی
بتاؤ راجپوتو شان ہے تم میں کہاں باقی

بزم میں یاد کر کے کہتے ہیں   آج کچھ شور و شر نہیں ہوتا

نظر آیا نہ کوئی دوست ہمیں   ایک کو کیا ہزار کو دیکھا

میری وفا کا انہیں واقعی یقیں ہوا — وہ اب سمجھنے لگے اپنا جاں نثار مجھے

---

(۲۳) بھارت

ٹھاکر بھارت سنگھ لسین نام اور بھارت تخلص، ٹھاکر اندر سنگھ کے فرزند ۱۲۹۲ف (۱۸۸۳ء) میں تولد ہوئے، اردو، فارسی، ہندی اور تلنگی سے بخوبی واقف ہیں، حضرت ترکی سے آپ نے تلمذ حاصل کیا ہے۔

کیا کہیں کس سے حال فرقت — اس درد کی ہو فقط دوا تم

صفائی سے دل کی یہ نوبت ہوئی ہے
جدھر دیکھتے ہیں صنم دیکھتے ہیں

ناز تو اپنے ہی لوگوں پہ ہوا کرتے ہیں
کون تکلیف دیا کرتے ہیں بیگانے کو

طوفان نوح گریہ عاشق کا جوش تھا
پھر اس کے بعد اور کوئی طوفاں نہ ہو سکا

رنج و غم و یاس و درد فرقت — انتوں کو سنبھال کر چلا ہوں

ہنستے کیوں حباب کے دم توڑتے پہ لوگ
انساں کی زندگی ہے نمونہ حباب کا

قیامت خیز طوفاں سے بچا لیتے ہیں کشتی کو
تلاطم خیز موجوں میں بھی ساحل دیکھنے والے

عاشق بنا کبھی کسی معشوق کے لئے
محبوب کا مقام لیا ہے کبھی کبھی

دکھاؤں جذبۂ الفت بلاؤں غیر کے گھر سے
کشش دل کی بھی دیکھیں نارسائی دیکھنے والے

---

(۲۴) داس بجرنگ سنگھ نام اور داس تخلص، راج پوت خاندان کے ایک قابل فرد تھے۔ شاعری کا بڑا شوق تھا۔ دیوان بھی مرتب کیا تھا۔

فرزندان جامعہ عثمانیہ

اب ہم اُن شعرا کو پیش کرتے ہیں جو جامعہ عثمانیہ کی پیداوار ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم کو ان کی تعداد کافی ہمدست نہیں ہوئی مگر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کا کلام نئے خیالات اور نئے جذبات کو لئے ہوئے ہے۔

(۱) الہام ڈاکٹر رگھو بیندر راج سکسینہ نام، الہام تخلص جامعہ عثمانیہ سے ایم، بی، بی، ایس کی ڈگری حاصل کی ہے اور طبابت کرتے ہیں۔ باقی کے نواسے ہیں، حیدرآباد کے خاندانی امیر اور ایک شاعر گھرانے

کے چشم و چراغ ہیں - رباعیات میں ان کا کمال فن اپنی شوخی و لطافت کو آشکار کرتا ہے تصوف سے ذوق رکھتے ہیں اور زیادہ تر رباعیات سے دلچسپی ہے رباعیات کا مجموعہ شایع ہو گیا ہے۔

ہر تیر ستم نشان پر آتا ہے ۔۔۔ ہر مرحلہ اب تو جان پر آتا ہے
مرنے کی ہوس مری بناوٹ کیوں ہو ۔۔۔ دل میں جو ہے زبان پر آتا ہے

تو روک لے گر ہاتھ تو پھر دے گا کون
مسجد سے میں ہٹ جاؤں تو پوچھے گا کون
سب میری یہ شیخی تری ہمت پہ تو ہے
تو کھل کے نہ بخشے گا تو بخشے گا کون

مت پوچھ کبھی پھر جو گنہ مجھ سے ہوا
دل مجھ کو دیا جرم یہ خود تجھ سے ہوا
لا، آج حساب اپنا بے باق کروں
کچھ تجھ سے ہوا ہو، کچھ مجھ سے ہوا

احباب میں لطف کی وہ خو بو نہ رہی
بلبل میں وہ سوز عشق کی خو نہ رہی
دنیا سے اڑا ہے رنگ یکسر سب کا
پھولوں میں وہ رنگ روپ خوشبو نہ رہی

گم کردہ رہی سے اپنی تھک جاتا ہوں
جادے سے گھڑی گھڑی بھٹک جاتا ہوں
مقصود حیات کو سمجھتا ہوں سراب
سایہ سے بھی اپنے کھٹک جاتا ہوں

---

(۲) روشن

روشن رائے، یہ ان کا قلمی نام ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے سپوت ہیں۔ نظم و نثر دونوں میں کمال حاصل ہے۔ انگریزی نظموں کا اردو نظم میں ترجمہ کرتے ہیں۔

خوش آمدید کہ تھیں منتظر بہت آنکھیں — تمھارے آنے سے اب دل کو کچھ قرار آیا
رعایا شاد ہے اور بار بار مسرور — ہر ایک لیئے یہ وقت خوش گوار آیا
تمھارا لوٹ کے آنا تمھیں مبارک ہو — تم آئے ہو کہ یہاں موسم بہار آیا
شہاب گنبد گردوں سے جس طرح آئے — نسیم نکہت گل لے کے جس طرح آئے
اسی طرح سے خبر شادیوں کی ہم کو ملی — اسی طرح در مغرب سے نامہ بر آئے

---

(۳) ارماں

شنکر موہن جامعہ عثمانیہ سے بی اے کی ڈگری حاصل کی ہے ہندی تخیل کو اردو شاعری میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح قدیم خیالات کو جدید سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ترقی پسند زمرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ کلام میں نازک خیالی کے جوہر پائے جاتے ہیں اثر بھی ہے۔

مزدور دوشیزہ

آئی اک مزدور کی لڑکی آج میرے باغ میں

زخم ڈالے اور بھی جس نے دل پر داغ میں
حُسن کی تقسیم کا بھی کچھ عجب معیار ہے
دیکھئے قدرت بھی کیسی غیر جانب دار ہے

ایک کا ہے حُسن گر آرائش قصر شہی
دوسرے کے دم کی زینت جھونپڑے سے ہو گئی
الغرض تخصیص اس کی قوم و ملت پر نہیں
آپ ہر طبقے میں پائیں گے حسیں رو مہ جبیں

ہاں تو اس مزدور دوشیزہ کی صورت دیکھ کر
کہہ نہیں سکتا ہوا دل پہ مرے کتنا اثر
اس کی طفلی ہو چکی تھی اب ہم آغوش شباب
یعنی وہ سن تھا کہا جاتا ہے جس کو لاجواب

اس کے اعضاء کا تناسب اس کا حسن دلفریب
رہزن ایمان و دیں غارت گر صبر و شکیب
چھپ سکا ملبوس کہنہ میں نہ حُسنِ بے مثال
آج دیکھا میں نے پہلی مرتبہ گدڑی میں لال

آؤ پریتم آؤ آؤ بن کے جوانی مجھ پر چھاؤ
آؤ مست فضائیں لیکر بھولی بھولی ادائیں لیکر
آؤ آؤ میرے پریتم
رات کو چھپ کر گاؤں میں آؤ تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں آؤ
آؤ بھیگی بھیگی فضائیں کالی کالی مست گھٹائیں
آؤ آؤ میرے پریتم

دھندلے دھندلے سپین میں آؤ — میرے مست احساس پہ چھاؤ
آؤ لب پہ تبسم لے کر — ارمانوں کا طلاطم لے کر
آؤ آؤ میرے پریتم

غزل کا نمونہ:-

اب کہاں وہ لطف عیش سرمدی تیرے بغیر
اک عذاب مستقل ہے زندگی تیرے بغیر
لکھ نہیں سکتا ہیں عنوان جوانی پر غزل
شاعر جادو بیاں میں یہ کمی تیرے بغیر

جاذبیت کچھ تو ہے آخر گداز شمع میں — خود فدا ہو جاتا ہے پروانہ پروانے کے بعد
جب ہوا بے دل تو پردہ غیریت کا اٹھ گیا — سوز میں بھی ساز آ جاتا ہے دل جانے کے بعد
یہ جہاں ارماں کبھی منزل گہہ عشرت نہیں — یہ کھلا ہے راز ہم پر ٹھوکریں کھانے کے بعد

---

(۴) مہندراج سکسینہ رگھونندراج کے چھوٹے بھائی مہندراج بھی شاعر ہیں جامعہ عثمانیہ سے یم-ایس-سی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ عموماً رباعیات موزوں کرتے ہیں، عمر خیام کی رباعیوں کو اردو کا جامعہ پہنانے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

ہوتا ہے مرا شمار میخواروں میں — مشہور ہوں رند و نہیں قدح خواروں میں
اک گوشہ میخانہ سنبھالے ہوں میں — جاتا نہیں سرکاروں میں دربار وں میں

کیا شیخ کی سنتا ہے، ادھر آ، پی لے
دو دن تو ملے ہیں زندگی کے، جی لے
بجھنے کو ہے یہ شرر کسی لمحے میں
دو گھونٹ سہی دوا سمجھ کر پی لے

بڑھتا ہے مرا قدم، قدم کے آگے
جاتا ہوں میں حیطۂ عدم کے آگے
ہوتا نہیں واں شیخ و برہمن کا گذر
منزل ہے مری دیر و حرم کے آگے

---

(۵) کنول

کنول پرشاد نام، کنول تخلص، ترقی پسند اور مشہور شاعر ہیں، آپ کی پیدائش حیدر آباد کے ایک محلہ چوراہا جنسی میں ۵ اراپریل ۱۹۲۱ء میں ہوئی۔ حیدر آباد کے مختلف مدرسوں میں ابتدائی تعلیم پائی، اس کے بعد بنارس سے میٹرک میں کامیابی حاصل کی پھر جامعہ عثمانیہ سے استفادہ کیا اور تعلیم کی تکمیل کی۔ مگر اس کے بعد بھی تشنگی علم نے ابھارا اس لئے ۱۹۳۹ء میں لاہور سے آنرز اردو پاس کیا۔ چند سال کے بعد ۱۹۴۵ء میں ہندی ساہتیہ سمیلن پریاگ (الہ آباد) سے "ساہتیہ رتن" میں کامیابی حاصل کی ہے اس طرح اردو اور ہندی میں کافی دستگاہ رکھتے ہیں۔

سولہ سال کی عمر سے شعر گوئی کی ابتدا کی ۱۹۳۵ء میں اپنی سولہ نظموں کا مجموعہ "کنول پشپانجلی" کے نام سے شایع کیا جو بیحد مقبول ہوا، کنول پرشاد صاحب نظم بھی لکھا کرتے ہیں اور نثر بھی۔ آپ کی نظمیں اردو اور ہندی دونوں سالوں میں شایع ہوتی اور پسند کی جاتی ہیں۔ خدا نے آپ کو گلا بھی خوب دیا ہے۔ مشاعروں میں آپ کی نغمہ سنجی کی دھوم ہوتی ہے۔ کنول کی شاعری کی ابتداء

اردو شاعری سے ہوئی وہ غزل بھی کہتے ہیں اور نظم بھی، رباعی بھی موزوں کرتے ہیں اور گیت بھی۔

نثر کے میدان میں آپ افسانے، فیچر، نیم غنائی خاکے سب کچھ لکھتے ہیں جو حیدرآباد، اورنگ آباد اور بمبئی کے نشرگاہوں سے نشر ہوتے ہیں۔ اس وقت کنول پرشاد صاحب محکمۂ اطلاعات میں مددگار ناظم ہیں۔ ملازمت کی بے آب وگیاہ رہ نوردی خشک اور بے کیف دفتری زندگی کے باوجود شعرو شاعری اور افسانہ نگاری، فیچر، غنائی خاکے لکھنا آپ ہی کا دل وجگر ہے۔

آپ کے کلام کا پہلا مجموعہ انجمن ترقی اردو ہند کی جانب سے عنقریب شایع ہونے والا ہے۔

کنول پرشاد صاحب کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ایسی زبان میں شعر موزوں کرتے ہیں۔ اگر اسکو اردو رسم الخط میں لکھیں تو، اردو اور ناگری رسم الخط میں لکھیں تو ہندی بھی جائے۔ ابتدا سے آپ کی یہ کوشش رہی ہے کہ ایسی زبان میں شاعری کریں جس کو اردو دال اور ہندی بولنے والے دونوں سمجھ سکیں۔ آپ کی یہ کوشش بارآور ہوتی جارہی ہے۔ کنول کی شاعری میں لوچ ہے۔ شیرینی ہے۔ حلاوت ہے، زور ہے، تخیلات کی بلندی ہے، خیالات کی رفعت ہے۔ اسلوب کی نزاکت ہے، بیان کی لطافت ہے، تشبیہوں اور تمثیلوں کی ندرت موجود ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

مجھ سے میرا نام نہ پوچھو

میں راہی ہوں ایک اکیلا

گھیرے رہتا راہ کو جسکی ہر دم طوفانوں کا ریلا

تم اپنے دھندلے دن دیکھو میری ڈھلتی شام نہ پوچھو
مجھ سے میرا نام نہ پوچھو

تھک کر چور ہوا جاتا ہوں
جتنا چلتا ہوں منزل سے اتنا دور ہوا جاتا ہوں
اُجڑے گھر میں بسنے والو میرا اُجڑا گرام نہ پوچھو
مجھ سے میرا نام نہ پوچھو

سایہ بجھ سویرے رونے والو
جینے کے پیچھے مر مر کر اپنا جیون کھونے والو
اپنے اچھے دھندے دیکھو میرا اچھا کام نہ پوچھو
مجھ سے میرا نام نہ پوچھو

آزادی کا دیوانہ ہوں
انگاروں میں کھیلنے والا اک البیلا پروانہ ہوں
تم سو نیند ھن میں جکڑے ہو آزادی کے دام نہ پوچھو
مجھ سے میرا نام نہ پوچھو

دنیا کا رنگ دیکھ رہا ہوں
منڈلاتے طوفانوں بھونچالوں کا بھی ڈھنگ دیکھ رہا ہوں
کانپ اٹھو گے دنیا والو دنیا کا انجام نہ پوچھو
مجھ سے میرا نام نہ پوچھو

آزادی کے بعد

طویل نظم ہے چند بند ملاحظہ ہوں۔

یہ کیا ہو رہا ہے یہ کیا ہو رہا ہے
خوشی کا زمانہ ہے دل رو رہا ہے
ہیں چرچے زمانے میں بیداریوں کے
مگر جس کو دیکھو وہی سو رہا ہے

لہو پی کے صدیوں کا امنڈے تھے بادل
تھا مدت پہ پھیلا گھٹاؤں کا کاجل
سمجھتے تھے برسینگی امرت کی بوندیں
گلوں سے بھرینگے خزاؤں کے آنچل

یہ حیرت سے یہ چاند تاروں نے دیکھا
دھڑکتے دلوں سے بہاروں نے دیکھا
جو پھیلے تھے چننے کو رحمت کے موتی
یہ ان آنچلوں کے کناروں نے دیکھا

---

(۶) **فہیم** ہیم چندر پرشاد نام اور فہیم تخلص، نظام کالج سے بی اے میں کامیابی حاصل کی۔ اپنے طالب علمی کے زمانہ سے مضمون نویسی اور شعر گوئی کرتے ہیں۔ رسالہ نظام ادب میں ان کے افکار نظم و نثر شایع ہوا کرتے تھے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

تم ہو اور مشق جفا کاری ہے　　ہم ہیں اور پاس وفاداری ہے
دل بہل جاتا ہے اس سے دم بھر　　تجھ سے تصویر تری پیاری ہے
تیرے بیمار پہ اے رشک مسیح　　آج کی رات بہت بھاری ہے
ہے جو بیمار چمن میں نرگس　　تیری آنکھوں کی فسوں کاری ہے

کیسے جانبر ہو فہیم مجروح
زخم اوچھا سا نہیں کاری ہے

زندگی میں نہ لی خبر جس نے　　کیوں وہ سوئے مزار آتا ہے
جان جاتی ہے زلف مشکیں پر　　رخ رنگیں پہ پیار آتا ہے

دیکھو پھر وہ، فہیم دیوانہ
جانب کوئے یار آتا ہے

---

(۷۰) ستم

کشن دیال نام اور ستم تخلص، کایستھ قوم کے سپوت ہیں۔ جامعہ عثمانیہ سے بی ۔ ایس سی ۔ کی ڈگری حاصل کی سائنس کی ڈگری لینے کے باوجود ادبیات سے شغف ہے، اردو، فارسی میں کافی مہارت رکھتے ہیں، حصول تعلیم کے لئے امریکہ گئے ہوئے ہیں۔ میر یاور علی خنجر کو اپنا کلام دکھلاتے تھے۔ شعر و سخن سے بہت زیادہ دلچسپی ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے

یہ کنج قفس میں ازل سے ابد تک
بگڑتا رہا مسکراتا رہا

آپ کے عشق میں ہم جی سے گذر جائیں گے
اور اگر یہ بھی نہ ہوگا تو کدھر جائیں گے

تونگر کی پذیرائی یہاں بھی ہے وہاں بھی ہے
جنوں کی کار فرمائی یہاں بھی ہے وہاں بھی ہے

ظفر لنکا پہ راجہ رام جی نے آج پائی ہے
مسرت کی گھٹا ہر سمت ہر ذرہ پہ چھائی ہے

بُرا نہ مانو تو ایک بات میں کہوں تم سے
تمھارے سر کی قسم کس قدر حسیں ہو تم

کیا مرض ہے یہ لادوا یا رب
اس مرض کی دوا کرے کوئی

(۸) **شوق** رائے رگبیر پرشاد نام، شوق تخلص، جامعہ عثمانیہ میں تعلیم پائی اور یم اے کی ڈگری حاصل کی۔ آپ کے بھائی حکیم ست گرو پرشاد صاحب کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ رسالہ سب رس میں آپ کا کلام شایع ہوتا ہے۔

کرشمے بھی تیرے اے سوزِ الفت کیا نرالے ہیں
کسی جا شمع بنتا ہے اور کہیں پروانہ ہو جانا

آنکھیں ہوں گر تو گھر میں ہے لیلیٰ جناب قیس
کیا ڈھونڈتے ہیں نجد کے ریگ رواں میں آپ

یوں جو ہر ایک سے اُلجھتی ہے کس کے دامن کا خار ہے دُنیا

۹- دلکش کے شنکر لعل نام، دلکش تخلص، سائنس کی تعلیم پائی اردو شاعری کا اچھا ذوق ہے نظام ادب میں غزلیات شائع ہوئی ہیں۔

بجلیاں لاکھوں گریں پھر بھی نہ جنبش ہو سکی
چار تنکوں کا کچھ ایسا آشیاں رکھتا ہوں میں
بے سرو ساماں سمجھ کر اے عدو آگے نہ آ
قلب میں ایمان کی چنگاریاں رکھتا ہوں میں
کیوں برائی پر کسی کی میں نظر دلکش کروں
زندگی کے ہر عمل میں خامیاں رکھتا ہوں میں

۱۰- سرکش ٹی ایس داس دیوراؤ نام، اور سرکش تخلص، سرکش بھی سائنس کی تعلیم پائی اور شاعری کا شوق بھی دامنگیر رہا ہے، کالج میگزین میں غزلیات شائع کرتے رہے۔

اے شمع حسن جاناں ظاہر تو آج ہو جا — ملنے کو آرہا ہے پروانہ زندگی کا
او مست آنکھ والے ہو اک نظر ادھر بھی — ہاتھوں سے چھوٹتا ہے پیمانہ زندگی کا
جنوں عشق سرکش طاری تھا ان پہ ہر دم — سمجھا یا ہوں یہ مشکل افسانہ زندگی کا

۱۱- پریمی پی این ماتھر نام اور پریمی تخلص نظام کالج میں تعلیم پائی ترقی پسند شعرا میں شامل ہیں غزل اور نظم دونوں موزوں کرتے ہیں۔

آکہ محلوں میں امیروں کے اندھیرا کر دیں
اور کٹیوں میں غریبوں کے اجالا کر دیں
آکہ طوفان تباہی کو اشارا کر دیں
دہر فرسودہ میں اک زلزلہ پیدا کر دیں

آ بدل ڈالیں زمانے کے سبھی رسم و رواج
آ بنائیں نئے آئین و قوانین سماج

یہ جہاں جس میں پلے کینہ و نفرت کا غبار
ہے یہ آوارہ و ناکارہ خیالوں کا دیار
اسی پر فرد ہے ہر فرد سے نفرت کا شکار
یہ جہاں جس میں کہ ہے ظلم و ستم کو بھی ابھار
آ بدل ڈالیں زمانے کے سبھی رسم و رواج
آ بنائیں نئے آئین و قوانین سماج

۱۲- رامیش چندر

اشتھانہ خاندان کے ایک سپوت جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل رامیش چندر کو شاعری سے دلچسپی ہے، جامعہ کے مجلہ میں ان کا کلام شائع ہوتا ہے۔ رامیش تخلص کرتے ہیں۔

حسنِ جدت طراز کا عالم — فطرتِ بے نیاز کا عالم
دل وارفتہ بھی سمجھ نہ سکا — کششِ چشمِ ناز کا عالم
وجہ تسکین شامِ تنہائی — اب بھی ہے دل کے راز کا عالم
یاس و ارماں کا امتزاج لطیف — میری شامِ دراز کا عالم
چھا رہا ہے مرے تصور پر — پھر کسی مستِ ناز کا عالم
کیوں بنائیں کسی کو آج رمیش — لذتِ سوز و ساز کا عالم

لہ مجلہ عثمانیہ جلد (۲۱)

۱۳ - فخر

پی سرینواس راؤ فخر گاندھی جی کی تحریک ستیاگرہ سے بہت متاثر تھے۔ اُن کے خیالات اور اپنے بھائی شری پی ہنمنت راؤ صاحب کے ستیاگرہ میں عملاً شرکت سے متاثر ہوئے ضلع محبوب نگر کے ہونہار اور تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ایک نئے ادارہ انجمن ترقی تعلیم کی بنیاد ڈالی۔ ذیل کی نظم خود فخر صاحب نے اسی ادارہ کے ایک مشاعرہ میں بتاریخ ۱۶ر اسفندار ۱۳۴۰ف پڑھ کر سنایا۔

"نقاب اُن کا اُلٹنا رات کا کافور ہو جانا"

خودی میں مبتلا ہونا خدا سے دور ہو جانا
قیامت ہے دو روزہ عیش میں مخمور ہو جانا

اِدھر دولت جمع ہوتی اُدھر مفقود راحت ہے
شب دیجور کی آمد ضیا کا نور ہو جانا

ہمارے اور ساماں حق کی مرضی اور ہوتی ہے
کہاں سامان راحت اور کہاں رنجور ہو جانا

مٹا دو اپنی ہستی کو اگر عزت کی خواہش ہے
جو سرمہ چشم بننا ہو تو مثلِ طور ہو جانا

ہر راہ دنیا ہم کو دیکھتی جاتی ہے حیرت سے
بلا ہے فخر دنیا میں کوئی مشہور ہو جانا

ایک دوسری نظم یہ ہے۔

یارب یہ آرزو ہے یہ میری التجا ہے
ہر بات میں اثر دے یہ میری دعا ہے

تو میری زندگی کو وہ مرتبہ عطا کر
انساں کی زندگی کا اعلیٰ جو مرتبا ہے

مٹ جاؤں میں جہاں سے اسکا نہیں ہے کھٹکا
گر نفع ملک اس میں کچھ بھی چھپا ہوا ہے

وہ ہند جس کی شہرت عالم میں چار سو تھی
عالم ہے جس کا نقشہ اتنک نہیں مٹا ہے

آئی ہوا خزاں کی رنگِ چمن ہے بگڑا
مشکل ہے یا الٰہی انساں کا سامنا ہے

غیروں کی کوششوں سے مسلم و ہندوؤں میں
نخلِ مخالفت اب مضبوط ہو رہا ہے

غافل کبھی نہ رہنا ہندستان والو!
ہر سو نفاق کا دام اس جا بچھا ہوا ہے

برباد ہو رہا ہے یہ مادرِ وطن پر
غفلت کا پردہ تم سے اتنک نہیں اٹھا ہے

آزاد کردے ہم کو سارے مخالفتوں سے
یارب مدد ہو تیری تیرا ہی آسرا ہے
وہ دن دکھا دے یارب جنّت نشاں بنے ہند
مشہور ہو جہاں میں یہ فخر کی دعا ہے

خواتین

شاعری کا تذکرہ ختم کرنے سے پیشتر ہندو شاعر عورتوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ اگرچہ کہ ان کی تعداد دو چار سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ دکن میں بھی ہندو عورتیں اردو شاعری میں حصہ لیا کرتی ہیں

(۱) مسز برکت رائے

آپ مہاراجہ کشن پرشاد کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں ۱۹۰۲ء میں حیدرآباد میں آپ کی ولادت ہوئی۔ رواج خاندان کے مطابق گھر پر تعلیم ہوئی، اردو، فارسی، ہندی اور انگریزی میں مہارت پیدا کی۔ مضمون نگاری اور شاعری کا شوق رہا۔ قومی اور ملکی، سماجی کاموں سے پوری دلچسپی رہی۔ شاعری کا مذاق اگرچہ ابتدا سے تھا مگر اس کی جانب بہت بعد میں توجہ کی گئی۔ بچوں کی لئے نظمیں خوب لکھا کرتی ہیں۔ ایک مجموعہ "بچوں کے بتاشے" کے نام سے شایع ہوا ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

تارے ہو تم یا ماہ پارے
کیسے اُجلے ہو تم پیارے
جھلمل جھلمل کرتے ہو تم
دکھتے ہو اور چھپتے ہو تم
کوئی تم سے چھپنا سیکھے
چھپ کر پھر دکھنا سیکھے
کیسی ہو گی آنکھ مچولی
کھیلیں گے ہم سب ہمجولی

چمک یہ تم نے کہاں سے پائی
غور کیا پر سمجھ نہ آئی

کاشش تمھیں گر لے سکتی میں
کنٹھی ایک بنا سکتی میں

فلک پہ تارے پڑے ہیں ایسے
تاج میں ہیرے جڑے ہوں جیسے

ہاں ہاں میں نے سمجھا کچھ کچھ
اس دنیا کا تاج ہے سچ مچ

یہ دنیا پھر نورانی ہے
اور تاج اس کا لاثانی ہے

---

(۲) شیل بالا

شیل بالا صاحبہ بی اے بی ٹی کے اجداد آگرہ کے رہنے والے ہیں شری منگل پرشاد آپ کے والد آگرہ کے معززین میں شامل ہیں۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں شیل بالا صاحبہ تولد ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم اندور میں ہوئی پھر بنارس یونیورسٹی سے بی اے اور بی ٹی میں کامیاب ہوئیں حیدرآباد کے مشہور شاعر کنول کی شریک زندگی ہیں۔ سنہ ۱۹۴۲ء سے سنہ ۱۹۴۵ء تک سرجسی لال گرلز ہائی اسکول کی صدر ہیں اور اب حکومت آندھرا کے سرکاری اسکول میں معلمہ ہیں۔

شیل بالا صاحبہ اپنی تعلیم کے زمانہ سے ہی سے ہندی اور اردو میں افسانے اور نظمیں لکھا کرتی ہیں۔ اداکاری میں بھی مہارت ہے۔ حیدرآباد اور اورنگ آباد کے نشر گاہوں سے آپ کے ڈرامے اور نظمیں نشر ہوتے ہیں۔

ہندی شاعری میں شیل بالا صاحبہ کا خاص مقام ہے۔ آپ کی شاعری بڑی صاف اور سلیس ہوتی ہے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ دراصل "ہندوستانی" شاعری کرتی ہیں جس کو ہندی اور اردو داں دونوں سمجھ سکتے ہیں۔ آپ کا کلام پر اثر اور وجد آفریں ہوتا ہے اردو مجلس میں بھی اکثر آپ اپنا کلام سناتی ہیں۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

کس کو بھولوں کیا یاد کروں

سکھ دکھ دونوں ہی اپنے تھے ۔ ۱ ۔ کس کو بھولوں کیا یاد کروں
دیتھو کے پتوں پر بیل کر ۔ سکھ کے اس رِت رتھ پر چڑھ کر
میں نے نیا جیون دیکھا تھا ۔ جیون کی گتھی پہچانی تھی
میرے سپنوں کی الکاتب ۔ سکھ میں جھومی مستانی تھی
پر ٹیا بیٹھی وہ اندر جال ۔ کھو گئیں سبزی مینار یں
ٹوٹے گنبد پر اساروں کے ۔ ڈھ گئی دلکش دیواریں

جیون کے سونے سم تل کو
کیسے پھر سے آباد کروں

چھائے تھے مدماتے بادل ۔ ۲ ۔ مانو بھولے ہوں تیل کمل
مدھو کے کن رم جھم رم جھم ۔ میرے مدھوبن میں جھرتے تھے
ملہار راگنی کے داسر ۔ میرے کانوں کو بھرتے تھے
رک گئے اچانک کومل سُر ۔ جل دھر میں بجلی کڑک اٹھی
پرتھوی پلٹ اچھل پڑا ۔ جوالا اک پھر سے بھڑک اٹھی
مدھوبن کے مرد تھل پر بیٹھی ۔ ہنس لوں میں یا کہ وشاد کروں

کس کو بھولوں کیا یاد کروں

پھولا بسنت یوں بیت گیا ۔ ۳ ۔ مدرا کا پیالہ ریت گیا
میں دور گئی ہوں من سُر میں ۔ پھیکی میٹھی میٹھی باتیں
جن میں یگ بھی پل ہو جائیں ۔ بیتی ایسی ماوک راتیں

سکھ کے دن جب یوں بیت گئے
کیا ہوگا ان کی یاد کئے
بوجھل میں مانس ہوتا ہے
ان کا پاگل انمار رلئے
تب وہ دن کا سواگت کرلوں
یاس اس کا پرتی داد کروں

کس کو بھولوں کیا یاد کروں

۴

پر یہ ہل چل بھی ٹھیک نہیں
درڑھتا کی ہی ہے بات سبھی
مدرا کی دھارا سے جس سے
تھا تلک کیا اس دن میرا
اس کی یہ بھینٹ بلا بل بھی
جیون پاتے یہ ہے میرا
جو سورگ بسایا تھا تم نے
میری راتوں کو روشن کر
مجھے کو پیارے ہونگے ہردم
ان کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر پر
مدھو جب گلے لگایا تھا
کیوں کڑوے پر فریاد کروں
پھر کیوں پوچھوں سکھ دکھ میں سے
کس کو بھولوں کیا یاد کروں

(۳) رتن

رتن کندن لال، راجپوت خاندان کی شاعرہ ہیں آپ کے والد کندن لال آج سے تیس سال قبل بنارس سے حیدرآباد آکر بس گئے تھے۔ رتن کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی۔ گھر کا ماحول علمی رہا۔ والدہ زنانہ اسکول میں ملازم تھیں۔ بڑے بھائی تعلیم یافتہ تھے۔ اس طرح رتن بائی کو بچپن سے علم کا شوق رہا۔ ابتداءً مدرسہ تعلیم بائی، مغل پورہ اسکول کی تعلیم کے بعد زنانہ سٹی ہائی اسکول میں شریک ہوئیں،

اور اردو میڈیم سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اس کے بعد زنانہ کالج میں شریک ہوئیں اسکول کی تعلیم میں اکثر اول آکر انعام حاصل کرتی رہیں۔

زنانہ کالج میں ۱۹۵۲ء شریک ہوئیں اور اردو میڈیم میں ایف یس سی پاس کیا۔اس کے بعد بی یس سی میں شریک ہوئیں انگریزی میڈیم لینا پڑا۔ کیونکہ زنانہ کالج میں سائنس کی تعلیم اردو میڈیم سے بند ہو چکی ہے۔ رتن کا مضمون حیوانیات ہے۔ بی۔یس۔سی کی کامیابی کے بعد یم۔یس۔سی میں شریک ہوئیں اور سال اول کا امتحان درجۂ اول میں کامیاب کیا اب آخری سال کی تیاری کر رہی ہیں۔

جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے رتن سائنس کی تعلیم پا رہی ہیں مگر اس کے ساتھ فنون لطیفہ سے بڑی دلچسپی ہے۔ ذوق وشوق اور انہماک سے اس فن کے کئی شعبوں میں حصہ لیتی ہیں۔ چنانچہ مصوری کا شوق بچپن سے ہے ڈرائنگ کے دو امتحان بمبئی سے پاس کئے مصوری کے جملہ شعبوں میں دسترس ہے۔ آئل پینٹنگ، واٹر کلر وغیرہ میں اچھی مہارت ہے۔ مناظر قدرت کی عکاسی کا شوق ہے۔ کئی اچھی اچھی تصویریں بنائی ہیں۔ جن میں کشمیر کے قدرتی مناظر بھی شامل ہیں۔ دستکاری میں کروشیا وغیرہ میں مہارت حاصل ہے۔ فنون لطیفہ کی دوسری شاخ شاعری سے بھی دلچسپی ہے۔ غزل اور نظم دونوں لکھا کرتی ہیں۔ قدرتی طور پر چونکہ فنون لطیفہ سے خصوصی مناسبت ہے اس لئے شاعری میں آمد پائی جاتی ہے شاعری کا رنگ المیہ ہے یاس اور حسرت انکی شاعری کے المیہ نشان ہیں۔ توقع ہے کہ آگے چل کر اچھی شاعرہ بن جائینگی۔

بار بار آکے خیالوں میں لایا نہ کریں — کوئی کہدے مری ہستی پہ وہ چھایا نہ کریں

آہ بن بن کے وہ لب تک مرے آیا نہ کریں — روح بیتاب میں اس طرح سمایا نہ کریں

مے الفت سی میں خود مست ہوئی جاتی ہوں　　چشم مخمور سے یوں آپ پلایا نہ کریں

وعدہ تو کیا تم نے اور نہ آئے وعدہ پر
جب تمھیں نہ آنا تھا آئے کیوں خیالوں میں

(۴) تلسی مانک لال

تلسی کے والد کشمیر سے آکر حیدرآباد میں بس گئے تھے۔ تلسی نے اولاً خانگی طور پر اردو، ہندی، انگریزی کی تعلیم پائی اسکے بعد پونہ کے مشن اسکول میں شریک ہوئیں اور ساتھ ساتھ گھر پر اردو اور فارسی کی تعلیم بھی حاصل کرتی رہیں۔ پھر لاہور جاکر پنجاب یونیورسٹی سے بی اے میں کامیابی حاصل کی۔ تلسی کو اردو ادب اور شاعری کا خاص ذوق ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

ایک ہی وقت میں اتنے آنسو　　وہ اگر بار دگر یاد آیا
سجدۂ شوق کو کیا قید مقام　　کرلیا سجدہ جدہر یاد آیا
کس قدر آنکھ سے نکلے آنسو　　جب بھری شام کو گھر یاد آیا

رُباعی

انگارۂ خاکی میں یقیں پیدا کر　　بال و پر جبریل امیں پیدا کر
کیوں دو کو جگہ دیتا ہے اپنے دلمیں　　اک گھر کے لئے ایک مکیں پیدا کر

(۵) مسز گیان استھانہ

منالال صاحب کی دختر ہیں، پیدائش مرادآباد میں ہوئی۔ مگر تعلیم حیدرآباد میں ہوئی، جامعۂ عثمانیہ سے ہندی میں ایم، اے کیا ہے۔ امتحان میں اول آکر امتیاز حاصل کیا۔ اسوقت چادر گھاٹ کالج میں ہندی کی لکچرار ہیں، شاعرہ بھی ہے اور نثر نگار بھی۔ اگرچہ آپ کو ہندی کی شاعرہ کہا جاسکتا ہے، مگر آپ کا کلام اس نہج کا ہوتا ہے کہ ہندی اور اردو بولنے والے دونوں مستفید ہوسکتے ہیں۔ حیدرآباد کی نشرگاہ سے

اکثر و بیشتر آپ کا کلام نشتر ہوتا ہے۔ ہندی کے مشہور رسالوں مثلاً سریتا، اجنتا، دھرم یگ وغیرہ میں آپ کا کلام شائع ہوتا اور پسند کیا جاتا ہے، عرصہ تک ایک ماہوار ہندی رسالہ بھی آپ کی ایڈیٹری میں شائع ہوتا رہا ہے، نثر نگاری میں آپ عموماً تنقیدی یا نسوانی رموز پر اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں، کلام کا نمونہ پیش ہے۔

میرے گیتوں کو تم کیا جانو گے — ڈوب کے دیکھو تو تر جاؤ گے
منگاتے ہی آئے ابھی شاپوں کر — دروان مٹے آئے جگتی پر
انکے انتراں میں جب ڈوبو گے — کمتی کا مرمیں تب ہی تم جانو گے

اب جیون میں یہی وشواشس چاہیے

.. ..

جب تم بس گئے ہو من بستی میں
تو آج دور پاس کی بات ہی کیا
اب تمہارے پاس آنیکا نہ اب کاش چاہیئے

آج آخر دور تج سے تمہیں کیسے مان لوں میں
دیکھتے پت کو نشہ کے چاند دیکھے تھک رہا ہے
کال کے کٹو منگلپوش میں وشواش بھی کھو رہا ہے
پر تمہاری کلپنا کو ابھی سا کیسے مان لوں میں

تبصرہ اگرچہ تین صدی کی طویل مدت میں ایک سو سے کچھ زیادہ ہندو شعراء کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دکن کے صرف یہی ہندو شعراء ہیں کیونکہ حوادثات زمانہ کے باعث ہم بیسیوں شاعروں سے واقف نہیں ہیں جن کے کارنامے معدوم ہو چکے ہیں۔

قطب شاہی دور اور خود آصفی عہد میں ہندو مسلمانوں کی معاشرت اس طرح ملی جلی رہی کہ دونوں حقیقی بھائیوں کی طرح بسر کرتے تھے، اس لئے یہ ناممکن تھا کہ مسلمانوں کی طرح ہندو شعراء پیدا نہ ہوتے، یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کی بہ نسبت انکی تعداد کمتر رہی۔ کیونکہ دکن کے ہندوؤں کی مادری زبان تلنگی، مرہٹی اور کنٹری رہی ہے اس لئے یہ کسی قدر دشوار ہے کہ اردو میں شعر گوئی کا ملکہ پیدا کیا جائے، اس کے باوجود ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ایسے متعدد ہندو شعراء گذرے ہیں جو استاد سخن کہے جا سکتے ہیں اور ان کے کارنامے تاریخ ادب اردو میں آب زر سے لکھے جائیں گے۔ ہندو شعراء نے جملہ اصناف سخن میں داد سخنوری دی ہے اور اچھے سے اچھا کلام موزوں کیا ہے۔ فن شاعری کے لحاظ سے انکا کلام پسندیدہ اور قابل ستایش قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان شعراء کے کلام پر خواہ صفائی اور سادگی کے لحاظ سے غور کیا جائے یا نازک خیالی، تشبیہات کی ندرت اور استعاروں کی جدت کے لحاظ سے دیکھا جائے، تخیل کی بلند پروازی ہو یا خیالات کی گہرائی اور اسکے ساتھ ساتھ کلام کے تاثر کے لحاظ سے جانچا جائے تو ناکامی نہیں ہوتی۔ کئی ایک شعراء کے کلام کو اردو شاعری کے صف اول میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ انہوں نے صنف شاعری کے ہر قسم کے کلام میں اپنے نتائج فکر کے اچھے نقش ثبت کئے ہیں اور استاد سخن شمار کئے گئے ہیں ہر آئینہ ہندو شعراء کا کلام قابل تعریف ہے۔

(۲) نثر نگاری

صفحات گذشتہ میں تقریباً تین صدی کے ہندو شعرا کا حال پیش کر دیا گیا ہے۔ اب ہندو نثر نگاروں کا تذکرہ کیا جاتا ہے، مگر دقت یہ ہے گذشتہ زمانہ میں نثر نگاروں کے حالات پر کسی نے بھی توجہ نہیں کی تھی۔ جس طرح شعراء کے تذکروں سے شعرا کا حال اور ان کا کلام محفوظ ہو گیا ہے اسی کے مماثل نثر نگاروں کا حال اور انکی نثر کا نمونہ کسی کتاب میں ہمدست نہیں ہوتا۔ اس لئے جب کسی ادیب یا نثر نگار کے حالات کی جستجو کی جاتی ہے تو بڑی دشواری اور دقت پیش آتی ہے۔ ایک اور دوسری وجہ یہ ہے کہ زمانہ سابق میں علوم و فنون کی کتابیں زیادہ تر فارسی میں قلمبند ہوتی تھیں، اردو میں شعرا صرف طبع آزمائی کرتے اور اپنے کلیات اور دیوان مرتب کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اردو شعرا کے تذکرے بھی فارسی میں مرتب ہوئے ہیں۔ یہ وجوہات ہیں جنکی وجہ سے پہلے چار دور کے کسی ہندو ادیب یا نثر نگار کا نام سردست پیش نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ پانچویں دور کے ہندو نثر نگاروں اور ادیبوں سے ہم واقف ہیں گو ان میں بھی دو چار کا تعارف کرایا جا سکتا ہے۔

پانچواں دور

۱۸۰۵ء تا ۱۸۸۳ء
۱۲۲۰ھ ۱۳۰۱ھ

جیساکہ صفحات گذشتہ میں اس امر پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ اس دور میں شمالی ہند کے شعرا دکن میں آنے لگے تھے اس لئے یہاں کی شاعری کا رنگ بدلنے لگا۔ شعرا کی سرپرستی کرنے میں مہاراجہ چندولال کا نام جسطرح درخشاں نظر آتا ہے اسی طرح ستاروں کے متعلق امیر پائیگاہ نواب شمس الامرا امیرِ کبیر نواب فخرالدین خاں کا نام دنیائے اردو میں ہمیشہ یادگار رہیگا کہ آپ نے ایک دارالترجمہ قائم کرکے مغربی علوم کی کتابیں اردو نثر میں شائع فرمائیں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ نواب شمس الامرا کے پہلے ڈاکٹر جان گلگرائسٹ نے ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ایک دارالترجمہ قائم کردیا تھا۔ لیکن اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ انگریزوں کو اردو سیکھنے میں آسانی ہو اور دوسری غرض یہ تھی کہ اردو اور ہندی میں تفریق کی جائے اور دونوں زبانوں کو جدا جدا صورت میں پرورش کرنے کا بیج بویا جائے۔ چنانچہ دونوں اغراض پورے ہوگئے۔

اگر فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی تیار کردہ کتابوں پر نظر ڈالیں تو یہ امر اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ گویہ کتابیں اس زمانہ کے عام رجحان کے خلاف عام فہم اور سلیس زبان میں مرتب ہوئی ہیں' مگر جسقدر کتابیں تیار ہوئیں ان میں زیادہ تر قصے اور کہانیوں کی کتابیں ہیں تاکہ ایک اجنبی غیر زبان داں شخص دلچسپی سے پڑھ سکے اور اس کو جلد سے جلد زبان پر عبور حاصل ہوجائے' سائنس اور دیگر فنون کو ہاتھ نہیں لگایا گیا اگر فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات کو بلحاظ فن

تقسیم کیا جائے تو اسکی تقسیم حسب ذیل ہوتی ہیں۔

(۱) قصے کہانیاں (۲) لغت (۳) صرف و نحو (۴) تاریخ۔

(۵) اخلاق و مذہب۔

ان میں زیادہ تر قصے کہانیوں کی کتابیں ملتی ہیں، اگرچہ تاریخ اور اخلاق کا عنوان بھی نظر آتا ہے مگر ان فنون کی کتابیں ایک ایک دو دو سے زیادہ نہیں ہیں۔ اور پھر ان میں زیادہ تر فارسی کے ترجمے ہیں یا پھر تصانیف ہیں، مغربی زبانوں سے کسی کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ انکو مغربی زبانوں کے فنون کی کتابوں کی ضرورت نہیں تھی۔ اگرچہ اردو میں عام فہم اور سلیس کتابیں مرتب کرنے کی وجہ سے دنیائے اردو جان گلکرائسٹ کی ممنون احسان ہے مگر اس سے زیادہ موجب تشکر نواب شمس الامرا فخرالدین خاں کی ذات والاصفات ہے کہ اُنھوں نے آج سے ایک سو سال پہلے اپنی ذات سے ایک دارالترجمہ قائم کر کے مترجمین کے ذریعہ مغربی علوم کی کتابیں اردو میں ترجمہ کرائیں اور انکو شائع فرمایا، اور باقاعدہ تعلیم کا انتظام بھی فرمایا تھا۔

نواب شمس الامرا[1] کے مترجمین میں مسلمان، ہندو اور انگریز تینوں اصحاب کے نام ملتے ہیں۔ جن ہندو اصحاب کے کارناموں سے ہم واقف ہیں وہ یہ ہیں، رتن لال۔ منو لال۔ بچو لال اور رام پرشاد۔

رتن لال | رتن لال کا تذکرہ شعرا کے ذیل میں مست تخلص کے ساتھ کر دیا

---

[1] نواب شمس الامرا فخرالدین خاں کے علمی کارنامے اور اردو خدمات کے متعلق ہم نے ایک مستقل کتاب نواب ظہیر یار جنگ امیر پائیگاہ کی سرپرستی میں قلمبند کی ہے۔ اگر وہ شائع ہو جائے تو دنیائے اردو کو آپ کے کارناموں کا علم ہو سکتا ہے۔

گیا ہے، رتن لال نواب شمس الامرا کے متوسل اور آپ کے دارالترجمہ میں مامور تھے انگریزی زبان کی کتابوں کا ترجمہ کرتے تھے آپ کے دوسرے شریک کار مسٹر جوزف تھے۔ رتن لال کی تین کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک تو رسالہ علم و اعمال کرہ، دوسری کتاب رسالہ منتخب البصر اور تیسری کتاب عمدۃ التواریخ ہے۔ ہم مختصر طور پر ان تینوں کتابوں کی صراحت کرتے ہیں، رسالہ علم و اعمال کرہ ایک ضخیم کتاب ہے جو (۴۰۸) صفحات پر مشتمل ہے ۱۲۵۵ھ میں تالیف ہوئی اور ۱۲۵۷ھ میں نواب شمس الامرا کے سنگی چھاپے خانہ میں طبع ہوئی۔ کتاب کی فہرست (۲۹) صفحات پر حاوی ہے چار مقالوں پر کتاب منقسم ہے اور ہر مقالہ میں کئی ذیلی عنوان ہیں۔

جیسا کہ نام سے واضح ہے یہ کتاب علم اصطرلاب کروی پر لکھی گئی ہے دیباچہ کا انتخاب حسب ذیل ہے:۔

"پوشیدہ نہ رہے کہ یہ رسالہ ہے کرے کے علم اور اعمال میں کہ جس کو علم اصطرلاب کروی بھی کہتے ہیں، ۱۲۵۵ھ میں حضرت نواب شمس الامرا بہادر امیر کبیر کے حسب الحکم مسٹر جوزہ (غالباً جوزف صحیح ہے) اور بندہ رتن لال نے کہ دونو ملازم سرکار فیض آثار نواب ممدوح کے ہیں انگریزی زبان سے اردو زبان میں ترجمہ کیا اور یہ چند مسائل انتخاب کئے گئے ہیں اس کتاب سے جسکو حکیم کیت صاحب نے تالیف کیا ہے۔ اور اگرچہ وہ کتاب حاوی اکثر مسائل علم کرے کو ہے مگر اس میں چند مسائل ضروری انتخاب کر کے لکھے گئے۔

نفس مضمون کا نمونہ بھی قابل ملاحظہ ہے۔
"تعریف خسوف قمر کی":

"جب زمین چاند اور سورج کے درمیان میں حائل ہوتی ہے تو زمین کا سایہ چاند پر گر کے اس کا مانع نور ہوتا ہے اس کو خسوف قمر کہتے ہیں اور اس سبب سے خسوف قمر حالت بدر میں ہوتا ہے":

(۲) رسالہ منتخب البصر اس کے (۲۱۳) صفحات ہیں ۱۲۵۵ھ میں ترجمہ کیا گیا اور ۱۲۵۶ھ میں شائع ہوئی ہے۔ کتاب چھ مقالوں اور سترہ عنوان پر منقسم ہے علم ریاضی کی کتاب ہے۔

دیباچہ کا اقتباس ضروری معلومات فراہم کرتا ہے جو حسب ذیل ہے:-
"پوشیدہ نہ رہے یہ رسالہ موسوم بہ منتخب البصر بیچ علم دور نما کے کہ اسے علم المناظر بھی کہتے ہیں اور اس علم کی معلومات سے نقشے اجسام و سطوح کے کھینچے جاتے ہیں اور یہ علم طالبان علم فلاسفی کو بہت ضروری ہے کہ بغیر اس علم کے سمجھنا ان اشکال مجسمہ کا جو اکثر فلاسفی کتابوں میں کھینچے ہوئے رہتے ہیں مشکل ہے۔ اس علم میں اگرچہ ایک کتاب مبسوط فارسی زبان میں موسوم رفیع البصر لکھی ہوئی صاحبزادہ بلند اقبال عالی قدر محمد رفیع الدین خاں المخاطب عمدۃ الدولہ بہادر خلف امیر کبیر دام اقبالہ کی ہے۔ اور وہ کتاب جامع ہے تمام قواعد کلیہ دور نما کو اور حاوی ہے اشکال و دقایق مجسمہ کو۔ اور یہ بندہ عاصی پر معاصی رتن لال ولد چنیا لال کہ نمک خوار اس دولت ابد مدت کا ہے وقت

تیاری اس کتاب کے زبان ہدایت بیان صاحبزادہ موصوف سے بیان شکل سے سرفراز ہوا کرتا تھا............

.... اس عاصی نے حسب الحکم والا کے اس کتاب رفیع البصر سے قواعد آسان منتخب کرکے یہ رسالہ مختصر اردو زبان میں بطریق سوال وجواب اپنے استعداد اور حوصلے موافق لکھکر ملاحظہ مبارک میں گذرانا اور سرمایہ سعادت حاصل کیا۔"

اس اقتباس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب عمدۃ الدولہ کی فارسی کتاب سے ترجمہ کی گئی ہے اصل نفس مضمون کا نمونہ یہ ہے۔

"سوال۔ قطعہ دائرہ کی کیا تعریف ہے۔

جواب۔ قطعہ دائرہ اسکو کہتے ہیں ایک خط مستقیم دائرے کو ایسا قطع کرے کہ دائرے کے مرکز پہ سے نہ گزرے۔ جیساکہ اس پندرھویں شکل میں ا۔ د کا خط دائرے کو قطع کیا ہے۔ پس اس صورت میں اس دائرے کے دو قطعے ہوئے چھوٹے قطع کو قطعہ اصغر اور بڑے کو قطعہ اکبر کہتے ہیں، اور جو خط کے مرکز سے گزر کر دائرے کو قطع کرتا ہے اس کے ہر قطعہ کو نصف دائرہ کہتے ہیں اور اس کے نصف کو ربع دائرہ کہتے ہیں۔"

اس صراحت سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ رتن لال فارسی انگریزی اور اردو زبانوں کے ماہر تھے، اس کے ساتھ علم سائنس کی بھی مہارت حاصل تھی انکی تیسری کتاب عمدۃ التواریخ ہے۔

عمدۃ التواریخ | یہ تاریخ بڑی سائز کے (۳۰۶) صفحے پر حاوی ہے، اور ۱۲۶۸ھ میں تالیف کی گئی ہے۔ یہ پورے ہندوستان کی

مختصر تاریخ ہے، جس میں دکن کے علاقہ کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ اولاً مختصراً راجہ گانِ ہند کا ذکر ہے اس کے بعد مسلمان سلاطین کے حالات لکھے گئے ہیں، جن کتابوں سے مدد لیکر اس تاریخ کی تالیف ہوئی ہے انکا نام بھی تاریخ میں درج کردیا گیا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ فارسی تاریخوں کے علاوہ انگریزی تاریخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔ لارڈ ڈلہوزی کے حالات پر یہ تاریخ ختم ہوتی ہے۔ اس تاریخ کا ایک قلمی نسخہ حیدرآباد کے سنٹرل کتب خانہ (کتب خانہ آصفیہ) میں موجود ہے یہ تاریخ طبع بھی ہوئی ہے۔ مگر نایاب ہے۔

منو لال اسی زمانہ کے ایک دوسرے مترجم ہیں اگرچہ یہ دارالترجمہ شمس الامرا میں ملازم نہیں تھے بلکہ حکومت آصفیہ کے مدرسہ انجینرنگ کے پرنسپل تھے لیکن نواب رفیع الدین خاں عمدۃ الدولہ کے ایما سے انھوں نے ایک کتاب "ہندسہ بالوتر" کا ترجمہ کیا ہے۔

یہ کتاب (۵۶۲) صفحات پر حاوی ہے۔ غالباً اسکی طباعت نہیں ہوئی ہے اسکا ایک مخطوطہ ہے۔ جو نواب ظہیر یار جنگ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

کتاب میں اولاً اصطلاحات ہیں اور اسکے بعد سولہ باب پر کتاب منقسم ہے۔ دیباچہ کا انتخاب حسب ذیل ہے۔

"مرکز علم و دانش مرجع ارباب رائے و بینش جناب نواب رفیع الدینخاں شمس الامرا کے توجہ و ایما و نے جنکی تربیت و فیض سے علم ریاضی کے اعلیٰ اعلیٰ درجہ کے مفید کتابیں جن کا نشان اسوقت ترقی یافتہ زبانوں میں کہیں پایا نہیں جاتا۔ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں سے تالیف ہوچکے ہیں۔ اس خیال میں پوری وسعت دی اور نادر صاحب کی تصنیفات میں سے ہندسہ بالوتر کا ترجمہ کرنیکا

اتفاق ہوا۔ اردو میں پہلی کتاب ہے جو اقلیدس کے دقیق مسئلوں کو مساوات جبریہ میں آسانی سے تبلاتی ہے"۔

نفس مضمون کا نمونہ حسب ذیل ہے :۔

"یہاں خاصیت خطوط مستقیمہ اور خطوط منحنی و قوس وغیرہ کا جو کہ ایک سطح پر نقش کئے جائیں بذریعہ وترین کے کیا جاتا ہے اول یہ علم ضروری ہے کہ وترین نقطہ سے کیا مقصود ہے۔ فرض کرو "س" ایک نقطہ معلوم ہے۔ ایک سطح پر ہے اس میں دو خط علی القوائم لا س۔ لا اور ع س، ع گزرتے ہیں۔ فرض کرو "م" کوئی نقطہ اوس سطح میں واقع ہے م ن ۔ کو متوازی س ع کے کھینچو۔ خط س لا کو نقطہ ن س قطع کرتا ہے۔ اور م ل متوازی ہے لا س کے کھینچو۔ ل میں ع س کو قطع کرے۔ اب صریح ظاہر ہے کہ اگر س ن اور س ل معلوم ہوں تو جائے نقطہ م کے ہونگے"۔

رام پرشاد نواب شمس الامرا کے متوسل تیسرے صاحب رام پرشاد ہیں انکے والد کا نام مدن رائے تھا۔ اُنہوں نے ۱۲۷۳ھ میں "قواعد منتخب" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی تھی، کتاب کا حجم (۹۵) صفحہ ہے۔ اور یہ نو باب میں منقسم ہے۔ علم ریاضی کی کتاب ہے۔ کتاب کا نام تاریخی رکھا گیا ہے۔ دیباچہ کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

"عالمانِ علمِ حساب پر پوشیدہ نہ رہے کہ حسب الحکم معلی القاب امیر کبیر نواب شمس الامرا بہادر مدظلہٗ، کے اس احقر العباد رام پرشاد ولد مدن رائے نے کہ خانہ زاد موروثی اس جناب فیض مآب کا ہے۔ یہ مختصر رسالہ اردو زبان میں واسطے مفید ہونے طالبان اس

فن کے جو کہ صحاح دشوار اور اربعہ متناسبہ میں مہارت اور
اصطلاحات حسابیہ سے واقفیت رکھتے ہیں بیچ قواعد حسابیہ
کے لکھا گیا ہے اور نام اس رسالہ کا قواعد منتخب ہم نام اور
ہم مادہ تاریخ ہے رکھا گیا۔"

بچو لال شاعروں کی تفصیل میں بچو لال تمکین کا تذکرہ کردیا گیا ہے، تمکین کو نثر نگاری سے بھی شغف تھا۔ آپ کی تصنیف مواعظ نادر نثر میں ہے، کتاب آصفجاہ اول کے نصیحتوں کا ترجمہ ہے جو آصفجاہ نے اپنے انتقال کے وقت اپنے فرزند ناصر جنگ کو فرمائی تھیں، نمونہ پیش ہے۔

"پہلی نصیحت، رئیس دکن کو اگر سلامتی اپنی بے فکری و جنگ و جدل سے افزائش و آبادی ملک کی منظور نظر و مرکوز خاطر ہو تو چاہئے کہ مرہٹوں سے صلح رکھے، جو زمیندار اس ملک کے ہیں، جب تک ہو سکے سررشتہ صلح و آشتی کا ہاتھ سے نہ دے جب مجبور ہو تو معذور۔

دوسری نصیحت بنی آدم کی بنیاد ڈھانے میں بہت غور و تامل لازم ہے، کہ یہ عمارت صانع بے ریت و رنگ اپنے دست قدرت سے بنائی ہے۔ بھتا گیہوں جوار کا نہیں جو بویا کریں کاٹا کریں، اگر کوئی معاملہ واجب القتل کا روبہ کار ہو تو قاضی سے رجوع کرادے کہ وہ عہدہ دار ایسے بڑے کاموں کا ہے۔ عذاب و ثواب کا بوجھ اس کی گردن پر ہیگا وہ جو حکم کرے بجالاویں آپ ہرگز کسی کے قتل پر دھیان نہ کرے۔

قتل پر انسان کے جرأت نہ کرنا زینہار کیوں کہ مشتِ خاک ہی پر ہے ظہورِ کردگار

طلبہ مدرسۂ دار العلوم

نواب مختار الملک بہادر نے ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء میں مدرسۂ دار العلوم قائم فرمایا تھا۔ اس مدرسہ کی حیثیت گویا کالج کی تھی۔

دہلی کالج اور مدرسہ عالیہ کلکتہ کے نمونے پر اسکو قائم کیا گیا تھا۔ یہاں عربی فارسی کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ریاضی، طبعیات، کیمیا اور ہیئت وغیرہ کی تعلیم اردو میں ہوتی تھی۔ اور بطور مضامین اختیاری انگریزی، تلنگی اور مرہٹی کا درس ہوتا تھا۔ ۱۲۸۹ھ میں طلبہ کی تعداد (۵۰۵) تھی انکی جو تقسیم تھی وہ حسب ذیل ہے۔

خالص عربی کے طلبہ (۱۱۲) خالص فارسی کے طلبہ (۱۲۳)
عربی فارسی کے طلبہ (۱۴۸) تلنگی (۱۲) مرہٹی (۱۶)
فارسی و مرہٹی کے طلبہ (۱۴) تلنگی و مرہٹی (۳) فارسی و انگریزی (۲۴)
عربی و انگریزی (۹)[1]۔

مدرسہ دار العلوم کے دور اول کے طلبہ میں جن ہندو اصحاب کا نام ہمدست ہوا ہے انکی صراحت یہاں کی جاتی ہے۔ یہ طلبہ غالباً اردو کے نثر نگار بھی ہوتے تھے کیونکہ جو نصاب تعلیم مقرر تھا اُس میں اردو زبان کی کتابیں بھی شامل تھیں[2]۔

(۱) بھگونت راؤ (۲) سری رام (۳) کشن راؤ (۴) گوپال راؤ
(۵) کشن راؤ ثانی (۶) وٹھل راؤ (۷) راگھندر راؤ (۸) درگا سنگھ
(۹) رام داس (۱۰) نرہر راؤ (۱۱) بھگونت راؤ (۱۲) بسونت راؤ
(۱۳) شیش راؤ (۱۴) وٹھل راؤ ثانی (۱۵) کشن راؤ ثالث (۱۶) وامن راؤ
(۱۷) نارائن راؤ (۱۸) بلونت راؤ (۱۹) سیتا رام (۲۰) جیون[1] راؤ

---

[1] مواعظ نادر مخطوطہ سنٹرل ریکارڈ آفس ۳۰۲ تذکرہ دار العلوم مصنف راقم ص ۱۱۲

چھٹا دور

۱۸۸۳ء تا ۱۹۱۸ء
۱۳۰۱ھ تا ۱۳۳۶ھ

اب ہم ایسے دور کا تذکرہ کرتے ہیں کہ جبکہ سرکار آصفیہ کی سرکاری زبان فارسی سے اردو ہو گئی تھی، اردو کے رسالے اور اخبار شائع ہونے لگے تھے اس دور کے ہندو شعرا کی تفصیل گزر چکی ہے۔ اس دور میں ہندو ادیبوں اور انشا پردازوں کی پوری صراحت تو دشوار ہے کیونکہ شعرا کی طرح ان کے حالات کسی نے جمع نہیں کئے ہیں ہماری تحقیقات اور معلومات سے جن اصحاب کا سردست پتہ چلتا ہے انکا تعارف کردیا جاتا ہے۔ ممکن ہے آیندہ مزید اضافہ ہو سکے۔

(۱) مہاراجہ کشن پرشاد

مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنتہ آنجہانی کا تذکرہ شعراء کی ذیل میں کردیا گیا ہے مگر آپ ایک قادرالکلام شاعر کے ساتھ ساتھ زبردست ادیب صاحب فن نثرنگار اور بہترین انشاء پرداز بھی تھے، مہاراجہ کی نثر کی کتابوں میں ناول، سفرنامے مقالے اور خطوط ہیں جنکی تعداد خاصی ہے، آپ کے ناولوں میں خاکہ اور کردارنگاری دونوں کے اچھے نمونے موجود ہیں، سفرنامے دلچسپ ہونے کے علاوہ معلومات آفریں ہیں، ان میں تاریخی تحقیق بھی ہے اور سماجی و معاشرتی

امور کی صراحت بھی، درویشوں و فقیروں، اور اللہ والوں کا حال بھی لکھا ہے اور سیاسی اور سماجی لیڈروں کا بھی، مہاراجہ کے خطوط میں تبسم و قہقہہ بھی ہے اور متانت بھی، کبھی آپ کی نثر میں نظم کی نقش افرینیاں ملتی ہیں۔ ظفر علی خاں صاحب نے ایک مرتبہ اپنے رسالہ دکن ریویو میں مہاراجہ کی تالیفات پر تبصرہ کرتے ہوئے حسب ذیل صراحت کی ہے جو بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے۔

"پنڈت رتن ناتھ کے مذاق طبیعت کے لحاظ سے مہاراجہ کی تحریر پر بھی اثر پڑا ہے جو طرز تحریر پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ہے اس کا عکس مہاراجہ کشن پرشاد کی شاعری و نثر میں بھی نظر آتا ہے[1]۔"

مہاراجہ کے سفرنامے دو قسم کے ہیں ایک تو روزنامچے کے طور پر لکھے گئے ہیں۔ اور دوسرے سفرنامے میں مہاراجہ کی سرکاری رپورٹیں بھی دلچسپ اور معلومات آفریں ہیں بہرحال مہاراجہ کی نثر اپنی روانی، بیساختہ پن، شگفتگی کے لحاظ سے قابل قدر اور لایق ستایش قرار پاتی ہے۔

آپ کی نثر کے بعض نمونے یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) خطوط:-

ایک دوست کو لکھتے ہوئے اس امر کا جواب دیا گیا ہے کہ بعض اصحاب ان پر اعتراض کرتے اور آپ کے ادبی کارناموں کو پنڈت رتن ناتھ کی طرف منسوب کرتے تھے۔

---

[1] مہاراجہ کشن پرشاد صـ۲۲۸۔

"بیشک میں شاعر نہیں، نثار نہیں مگر ایسا بھی نہیں کہ بغیر کسی سہارے کے ٹٹو نہ چل سکے۔ آزمایش منظور ہے تو قلم و دوات لیں، کوئی مضمون یا خط یا کوئی سین وہ بھی لکھیں بندہ بھی گھسیٹتا ہے اسوقت قلعی کھل جائیگی۔ یہ میں نے مانا کہ میں منشی نہیں ہوں، انشاپردازی مجھے نہیں آتی اور نہ مجھے ابوالفضل یا نعمت خاں عالی ہونے کا دعوے ہے مگر ہاں مرزا علی بابا شیرازی الاصل کا شاگرد ہوں۔ سیدھی سادھی نثر لکھتا ہوں مگر انشائے خلیفہ اور مادھورام سے کم نہیں...... نظم میں نہ ذوق ہوں نہ مومن نہ امیر ہوں نہ داغ نہ غالب ہوں نہ بیدل نہ حافظ ہوں نہ سعدی مگر اپنے مطلب کو نظم میں موزوں کر لیتا ہوں۔ اردو نثر لکھنے میں یا ناول نویسی میں پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی۔ انکا نام میں نے اس وجہ سے نہیں لکھا ہے کہ میرے ہاں موجود ہیں۔ یا بقول آپ کے درست کے وہ مجھے نظم و نثر لکھ دیا کرتے ہیں نہیں نہیں ان سے پوچھ لیا جائے کہ جب وہ حیدرآباد آئے اسوقت میری اردو زبان کیسی تھی، اور انکا میری نسبت کیا خیال تھا۔ الغرض میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ مگر بھیا معمولی مکتوبات نویسی وغیرہ میں اگر غالب مرحوم کا چربا نہ اتارا تو ہار جاؤں۔ الغرض جو کچھ میں نے سیکھا استادوں سے سیکھا صحبت اہل علم و فضل کی رہی ہے، یہ میرا کلمہ غرور کا نہ سمجھئے۔ میں تو ہیچمداں ہوں......"[1]

---

[1] مہاراجہ کشن پرشاد ص۲۳۔

اور ایک خط میں غالب کا رنگ ملاحظہ ہو۔

"مہربان دوستان سلامت۔ تلوار پہنچی۔ میں تو ارمغان سمجھا تھا گر خط کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ابھی مول نہیں لی گئی۔ صرف میرے امتحان اور پسند کیلئے بھیجی ہے۔ اس قدردانی کا شکریہ' میں اس قابل تو نہیں ہوں کہ پرکھوں۔ مگر حضرت عباس کی قسم عمدہ عباسی ہے' جوہردار قوت بازوئے سپہ سالار اسکی شان ہے۔ فتح وظفر اسکا دم بھرتے ہیں' تعریف تو یہ ہے کہ دشمن بھی جان دیتے ہیں' اور اس پر مرتے ہیں۔ اور یہ انکے خون کی پیاسی واہ ری عباسی آبداری میں گوہر آبدار لولوے شاہوار جسکے نخل ہستی میں آب رسانی کی اسکا چمن سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ گویا خزاں کے جھونکوں سے نیست و نابود تو کیا ویران وتباہ ہو گیا۔ باڑھ ہے کہ سمندر کی دھار ہے۔ خم ابرو سے کم نہیں' قبضہ بھی عمدہ ہاتھ آیا۔ اچھے پر قبضہ پایا۔ تیغ شاہی کام ہے شاہوں کے قبضہ قدرت میں رہنے کا مہام ہے۔ اللہ مبارک کرے[۱]۔

(۲) آپ بیتی حالات:۔

"اگرچہ ہر فرد بشر جسکی استعداد علمی زیادہ ہو یا کم وہ اپنے سرمایۂ استعداد کے موافق نثر لکھ ہی لیتا ہے۔ مگر نثاری کا فن بالکل جداگانہ ہے جو آج کے زمانہ میں لٹریچر سے موسوم کیا گیا ہے۔ ہر کس و ناکس نثار نہیں ہو سکتا۔ بڑے بڑے عالم فاضل دیکھے گئے ہیں کہ

---

[۱] مہاراجہ کشن پرشاد ص۲۳۸۔

وہ باوجود اس لیاقت و فضیلت کے نثار یا نشی نہیں پائے جاتے
اردو کی دنیا میں اگرچہ نثاری کی بنیاد مدت سے پڑ چکی تھی۔ مگر متاخرین
میں مرزا غالب مرحوم کی اردوئے معلیٰ نے اردو زبان کے تن بیجان
میں روح پھونک دی۔ اردو معلیٰ پہلی کتاب ہے جو متاخرین کے زمرہ
میں مستند سمجھی گئی ہے .... میں نے
سب سے پہلے یہ کام کیا کہ اکثر اردو ناولیں جو مشہور مصنفین کے انمول
مضامین تھے انکا مطالعہ کیا۔ اور التزام کے ساتھ انکے روزمرہ محاورات
دلچسپ فقرات اور ضرب المثل کو قلمبند کرتا گیا۔ جب اس سے فارغ
ہوا تو انکو ازبر کر لیا۔ گو اسوقت میری عمر کے سفر کے ساتھ
فراموشی بھی ہوتی گئی۔ مگر ایک اقتضائے سن دوسرے شوق کی امنگ
نے مجھکو نچلا نہ رہنے دیا۔ میں نے ایک چھوٹا سا رسالہ موسوم بہ
"سرمایۂ سعادت" لکھکر شائع کرایا۔ یہ رسالہ کسی اہلِ زبان کی محک نظر
میں کسا نہیں گیا۔ یوں ہی اسکو طبع کرا دیا یہ ایک قصہ دو بھائیوں کا
ہے جس میں ایک خواندہ اور دوسرا ناخواندہ ہے۔ انکی طرز معاشرت اور
اتفاق و نفاق کا نتیجہ دکھلایا ہے۔ اس عرصہ میں رتن ناتھ سرشار کا
فسانۂ آزاد اودھ اخبار میں طبع ہونا شروع ہوا۔"

اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہو سکتا ہے کہ مہاراجہ کی افسانہ نویسی پنڈت رتن ناتھ سرشار سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ مہاراجہ کے ایک سفرنامہ کا نمونہ بھی پیش کیا جاتا ہے جس میں ناگپور کے سفر کے حالات ہیں مگر ہم اس سے ایک ایسا اقتباس پیش کرتے ہیں جو مہاراجہ کے تصوف کے شغف کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

"اللہ تعالےٰ کی یکتائی اور اسکی وحدت کا ثبوت ہم کو ہر وقت اور

ہر آن ملتا ہے۔ مگر غفلت کا پردہ عقل پر ایسا پڑا ہوا ہے کہ ہم محسوس نہیں کرتے۔ دنیوی تعلقات اور اسکی نیرنگیوں کے تماشوں کو ما سوا اللہ کی شان میں دیکھ دیکھ کر اپنی اوقات کو خراب کرتے ہیں۔ ورنہ اگر بغور تمام اور بنظر تعمق دیکھا جائے تو اسکی وحدت ہی کا سارا تماشا ہے۔ اِدھر زہرہ بی نے جانیکی خبر دی اور اسکے اسباب بظاہر ایسے جمع ہوئے کہ ناگزیر سیر و تفریح کا قصد مصمم ہوا............ الغرض چلتے چلتے راجہ کے باغ کی طرف پہنچے جہاں شاہ صاحب رہتے تھے۔ اور خبر لی کہ شاہ صاحب ہیں کہ نہیں معلوم ہوا کہ موجود ہیں، فوراً میں اتر کر پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ زائرین کا تانتا لگا ہوا ہے، اور منتظر فضل باری ہیں، اور معبود رب کے مظہر کو اپنا قاضی الحاجات سمجھکر امید کا دامن پھیلائے ہوئے ہیں، اور مظہر ذات نامتناہی عبودیت کے خلعت سے مزین ہو کر معبود رب کی تصویر بنکر ہر ایک کے درد کی دوا کرنے میں اپنی مسیحائی دکھا رہا ہے جل جلالہٗ جل شانہٗ اسوقت شاہ صاحب دوسری طرف متوجہ تھے میرے پس پشت کھڑے ہوتے ہی چونک کر فوراً میری طرف دیکھکر نظر ملائی بقول شخصے ؎

نین چھپائیں نہ چھپیں پٹ گھونگٹ کے اوٹ
چتر نار اور سورما کریں لاکھ میں چوٹ

نظر کا ملنا تھا کہ میرے قلب پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی جس کا اظہار قلم سے ممکن نہیں۔"

(۲) مانک راؤ پنڈت مانک راؤ وٹھل راؤ صاحب کا نام بحیثیت مورخ تاریخ دکن میں یادگار رہیگا۔ ضلع گلبرگہ آپ کا آبائی وطن تھا۔ ۱۸۶۶ء میں ولادت ہوئی۔ گھر پر اردو، فارسی، انگریزی اور مرہٹی کی تعلیم کا انتظام ہوا، گھر کی تعلیم کے بعد مدرسہ اعزہ میں شریک ہوئے اور کچھ عرصہ تک تعلیم کے بعد ملازمت کے سلسلہ میں منسلک ہو گئے۔ چونکہ آپ کے خاندان کو پائیگاہ خورشید جاہی سے تعلق تھا اسلئے آپ بھی یہاں ہی ملازم ہوئے امرا پائیگاہ کی مصاحبی کے ساتھ ساتھ مہتمی تعلیمات پائیگاہ پھر رکن فوج رہے ۱۹۳۶ء تک ملازمت کا سلسلہ باقی رہا۔ سنہ مذکور میں وظیفہ حاصل کر کے خانہ نشین ہوئے

مانک راؤ صاحب کی علمی خدمت کا سلسلہ ملازمت کے پہلے ہی سے شروع ہوتا ہے۔ انکی پہلی کتاب تفریح الحیات ۱۸۹۶ء میں شائع ہوئی اور ۱۹۳۲ء تک کتابوں کی تصنیف اور اشاعت کا سلسلہ باقی رہا۔ آپکے تصانیف کی فہرست حسب ذیل ہے:۔

شمار	نام کتاب	فن	شمار	نام کتاب	فن
۱	تفریح الحیات	اخلاق	۷	دستور حکمرانی	فلسفہ
۲	امرا اور غربا کی زندگی	"	۸	مفید الخواتین	نسوانیات
۳	راجہ اشوک کا جیون چرتر	تاریخ	۹	حالات و مقالات سقراط	سوانح و فلسفہ
۴	وید ورنتی	مذہب	۱۰	خیابان آصفی	تاریخ
۵	بستان آصفی ست جلدیں	تاریخ	۱۱	مرہٹوں کا تمدن	تاریخ
۶	اقوال بدھ	مذہب			

مانک راؤ صاحب کی تصانیف کو تاریخ اور اخلاق پر تقسیم کر سکتے ہیں جن میں تاریخی کتابوں کا حصہ زیادہ ہے، مختلف سائز کے (۹۸۴۴) صفحات پر

مانک راؤ صاحب کی کتابیں مشتمل ہیں۔ آپ کی تصانیف میں بستان آصفی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ کتاب تاریخ دکن خصوصیت سے سلطنت آصفیہ کی مفصل تاریخ ہے، اس میں نظم و نسق حکومت اور دیگر تاریخی امور کے متعلق جسقدر مواد موجود ہے بہت کم کسی دوسری کتاب سے حاصل ہو سکتا ہے۔

شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ جیسے مورخ نے اس کتاب کے متعلق جو رائے دی ہے وہ قابل ملاحظہ ہے۔

"اس بستان آصفیہ میں ایسے چمن و گلشن تاریخ لگے ہوئے ہیں جنکی بہار سے دل کی کلیاں کھلتی ہیں، اس میں عموماً دکن کے سلاطین کے خاندانوں اور خصوصاً خاندان آصفیہ کے اس بسیط و تفصیل سے حالات لکھے ہیں کہ اسکے مطالعے کے بعد پھر کسی اور تاریخ دکن کے پڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی، مصنف نے مستند تواریخ دکن سے سلاطین ماضیہ و حال کے حالات بڑی لیاقت و قابلیت و جاں فشانی و عرق ریزی سے استنباط کر کے لکھے ہیں، غرض وہ حیدر آباد نظام کے کلیات و جزئیات حالات کا آئینہ ہے۔"

گو یہ صحیح ہے کہ اس ضخیم کتاب میں چند خامیاں بھی ہیں مگر وہ ایسے نہیں ہیں جنکی وجہ سے مانک راؤ صاحب کے علمی خدمات کا اعتراف نہ کیا جائے۔ جو ذخیرہ تاریخی اس میں مل سکتا ہے وہ کسی اور جگہ بہم دست نہیں ہو سکتا۔ جب تک اردو زبان زندہ رہیگی مولف کا کارنامہ باقی رہیگا۔ انکی زبان سادہ سلیس اور بامحاورہ ہے۔

مانک راؤ صاحب کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"ابوالخیر خاں کا سلسلہ نسب حضرت شیخ فرید شکر گنج تک پہونچ کر

حضرت عمرؓ سے ملتا ہے، آپ کے پدر بزرگوار کا نام شیخ بہاؤالدین تھا، اور وہ معہ اپنے چھوٹے فرزند کے شکوہ آباد ضلع مین پوری میں مسکن گزین تھے، عنفوان شباب میں ذی اقتدار ہوئے، اور محمد شاہ بادشاہ دہلی کے حضور سے "خان بہادر" کا خطاب پایا اور جس زمانہ میں حضرت آصفجاہ اول عازم دکن ہوئے تو وہ بھی انکے ساتھ ہوئے حضرت موصوف نے انہیں دو ہزار منصب پانچسو سوار اور تین ہزار سپاہ کی جاگیر مرحمت فرمائی۔ سب سے پہلے جو اہم کام انہوں نے کیا وہ یہ تھا کہ آٹھ ہزار سواروں کے ساتھ باپونا یک کا مقابلہ کیا اور فتح پائی۔ جب نواب ناصر جنگ اپنے والد ماجد حضرت آصفجاہ اول سے معرکہ آرا ہوئے انہوں نے اپنا طرفدار بنانا چاہا لیکن انہوں نے بایں الفاظ انکار کر دیا کہ باپ کا جو ملازم ایسی حالت میں بیٹے کا شریک ہوگا وہ نہ صرف گناہ کبیرہ ہی کا مرتکب ہوگا بلکہ دنیا میں بھی سخت سزا پائیگا۔" (بستان آصفی جلد دوم ص ۵۴۸)۔

(۳) راجہ راجیشور راؤ راجہ راجیشور راؤ صاحب کا تذکرہ شعراء کے ساتھ ہو چکا ہے، آپ کو شاعری سے زیادہ نثر نگاری سے رغبت تھی مختلف فنون میں پینتیس ۳۵ سے زیادہ کتابیں تصنیف و تالیف فرمائیں منجملہ بعض حسب ذیل ہیں :۔

شمار	نام	فن	شمار	نام	فن
۱	محبوب الاخلاق	اخلاق	۴	گلزار دانش	اخلاق
۲	حدیقۃ الاخلاق	"	۵	ریاض دانش	"
۳	گلبن دانش	"	٦	کشف الاسرار	تصوف

۷	ہدیۃ الملوک	اخلاق	۱۹	نغمہ عنادل	نظم
۸	تاریخ جہانگیری	تاریخ	۲۰	تاریخ ہند	تاریخ
۹	معالجات کلب	حیوانیات	۲۱	طبقات اکبری	"
۱۰	تشریح الفرس	"	۲۲	مجموعۂ ضرب الامثال	لغت
۱۱	گنجینۂ امثال	لغت	۲۳	مجمع الالفاظ	"
۱۲	کارنامہ	تاریخ	۲۴	فرہنگ فارسی جدید	"
۱۳	نجم اللغات	لغت	۲۵	گلدستہ مصوری	آرٹ
۱۴	مفتاح اللغات	"	۲۶	راماین	تاریخ
۱۵	افسر اللغات	"	۲۷	مہابھارت	"
۱۶	فرحت کدہ آفاق	"	۲۸	کشکول	لغت
۱۷	قران السعدین	"	۲۹	القاموس الجدید	"
۱۸	مجمع البحرین	"	۳۰	الخط عثمانی	آرٹ

باقی تصانیف فارسی میں ہیں اسلئے انکو نظر انداز کر دیا گیا ہے اس فہرست سے واضح ہو سکتا ہے کہ راجہ راجیشور صاحب نے کس طرح مختلف فنون میں خامہ فرسائی فرمائی ہے لیکن آپ کو زیادہ تر "لغت" سے دلچسپی تھی اسی فن پر آپ کی تصانیف کا زیادہ حصہ مشتمل ہے۔ آپ کے علمی یادگاروں اور قلمی کارناموں کے کئی ہزار صفحات ہیں جو شائع ہو چکے ہیں مگر اسکے علاوہ راجہ صاحب نے بلحاظ حروف تہجی عربی، فارسی، اور اردو کی ایک لغت تیار فرمائی تھی جسکی چھبیس جلدیں مکمل ہیں، مگر افسوس ہے کہ اس ضخیم کتاب کی اشاعت نہیں ہوئی ہے۔ مانک راؤ صاحب کی طرح آپ کا نام بھی دنیائے اردو میں باقی رہیگا۔ آپ کا اسلوب بیان بھی صاف سادہ اور عام فہم ہوتا ہے۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

"جسوقت جنگجو بہادروں کے اجسام ہتھیار پہننے کیلئے بے چین ہو رہے تھے اسوقت جنگ کے باجوں کی آوازوں نے ان لوگوں کے دلوں میں شجاعت کی روح پھونک دی تھی جس سے سب کے دماغوں میں یہی دُھن سمائی ہوئی تھی کہ کب جنگ شروع ہو اور کب اپنے دل کی اُمنگ نکالیں۔ اسوقت ارجن نے اپنے دوست بھگوان سری کرشن سے جو انکی رتھہ چلا رہے تھے کہا دوست ذرا رتھہ کو ایسے مقام پر لے چلو جہاں سے میں طرفین کے بہادران کارآزما کو اچھی طرح دیکھ سکوں۔ بھگوان سری کرشن نے ارجن کے منشا کے موافق رتھہ کو دونوں افواج کے درمیان لیجاکر کھڑا کردیا۔ اور ہر ایک بہادر مرنے اور مارنے کیلئے بخوشی تیار تھا۔ چاروں طرف دریائے شجاعت کی لہریں موجزن تھیں سب کے چہروں پر رونق جھلک رہی تھی۔ یعنی سب کے مُنہ سے یہی آواز نکل رہی تھی کہ بزن بکُش"

(مہابھارت صلا)

(۴) راجہ تیجرائے

راجہ تیجرائے صاحب برہم چھتری قوم سے تعلق رکھتے تھے، آپ کے اجداد پائیگاہ کے متوسل تھے رائے خوب چند آپ کے مورثِ اعلیٰ تھے جو نواب ابوالفتح خاں شمس الامرا کے سرکار میں ایک ذمہ داری کی خدمت پر اپنے انتقال تک مامور رہے۔ رائے خوب چند کے بعد انکے فرزند سروپ چند اور انکے بعد انکے نواسے راجہ تلجا پرشاد پائیگاہ آسمانجاہی سے متعلق رہے۔

راجہ تیجرائے تلجا پرشاد کے فرزند تھے جو ۱۲۸۰ف میں حیدرآباد میں تولد ہوئے حسب رواج قدیم اردو فارسی اور انگریزی کی تعلیم پائی، بچپن میں والد کا سایہ

سر سے اٹھ گیا اسی لئے اعلیٰ تعلیم نہیں پائی بلکہ ملازمت کے دائرہ میں منسلک ہوگئے آسمانجاہ نے آپ کو آبائی خدمت پر مامور کردیا۔ اولاً مہتمم خزانہ اور سررشتہ دار فوج بنے پھر جب مجلس پائگاہ مرتب ہوئی تو آپ کو رکن فوج کی خدمت دی گئی آسمانجاہ کے انتقال کے بعد پادشاہ بیگم صاحبہ اور نواب معین الدولہ کے زمانہ میں اسی خدمت کو انجام دیتے رہے۔ جب راقم الحروف کے نانا مولوی حسین عطاء اللہ صاحب (جو میر مجلس پائگاہ تھے) کا ۱۳۲۶ھ میں انتقال ہوا تو راجہ تیجرائے صاحب انکی جگہ میر مجلس پائگاہ بنائے گئے جسکو انھوں نے اپنے انتقال تک جو ۱۹۳۵ء میں ہوا انجام دیتے رہے۔

راجہ تیجرائے کو اردو ادب سے دلچسپی تھی، اور کتابوں اور اخباروں کا دلچسپی سے مطالعہ کرتے تھے، اس دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ آپ نے اپنے مربی اور محسن آقا نواب سر آسمانجاہ کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ کیا اور ۱۳۲۰ھ میں اسکی ترتیب شروع ہوئی۔ اور نہایت محنت اور جانفشانی سے اسکا مواد مرتب کیا۔ اس سوانح عمری کو آپ نے "صحیفہ آسمانجاہی" سے موسوم کیا ہے اسکے دو حصے ہیں ایک میں آسمانجاہ کی سوانحعمری ہے جس میں امرائے پائگاہ کے مختصر حالات اور آسمانجاہ کی وزارت کا تذکرہ اور مختلف سفروں وغیرہ کے حالات لکھے گئے ہیں۔ اور دوسرے حصے میں آسمانجاہ کے سفر یورپ کے حالات کو جسکو نواب صاحب نے خود قلمبند کیا تھا درج کیا ہے۔

۱۳۲۱ھ میں یہ کتاب شائع ہوئی۔ حیدرآباد کے اخبار نویسوں نے اس پر اچھی تنقیدیں کی ہیں، نواب محسن الملک اور وقار الملک جیسے اصحاب نے بھی اسکی ستائش کی ہے۔ چنانچہ نواب محسن الملک نے لکھا ہے "کسی نے نواب سالارجنگ کی لائف نہ لکھی آپ نے حق خدمت خوب ادا کیا۔ نواب

آسمانجاہ کی ایسی عمدہ لائف لکھکر اپنی لیاقت اور سعادت ثابت کی "صحیفہ آسمانجاہی کی عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

آسمانجاہ کی شادی کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

"روز دوشنبہ کو صاحب عالیشان رزیڈنٹ صاحب بہادر کی دعوت معہ ایک سو دیگر صاحبان انگریز وافسران بلوارم و سکندرآباد کی بڑے تکلف سے جدید حویلی میں کی گئی۔ علیٰ ہذا ساچق و مہندی و شب گشت و باز گشت بھی یہاں کے رواج دستور کے موافق اس دھوم دھام اور تکلف سے آئے اور گئے کہ جسکا حال قلمبند کرنا یا تو ناول نویسوں کا کام ہے یا شاعروں کا نہ مجھ میں اتنی لیاقت ہے نہ قابلیت اسکا فوٹو کھینچ سکوں اور نہ میرا ارادہ اس قسم کی رنگ آمیزی کا ہے۔ حتی الامکان اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ سچے واقعات کو سلیس عام فہم عبارت میں ظاہر کیا جائے اور مبالغہ سے کوسوں دور رہوں"۔ صـ ۳۲ ۔

شمس الامرا کے حالات میں تذکرہ کرتے ہیں۔

"آپ کے محل میں ابتک بھی کیمیاوی تجربات کے آلات موجود ہیں جو انگلستان اور یورپ کے دیگر ممالک سے بصرف زر کثیر منگوائے گئے تھے۔ ان آلات کو آپ نے نمائش کے طور پر نہیں منگوایا تھا بلکہ ہر ایک آلہ کو خود استعمال کرنے کی لیاقت اور قابلیت رکھتے تھے۔ آپ کی تعمیر کردہ عمارت موسوم بہ جہاں نما اس زمانہ میں واقعی اسم بامسمیٰ تھی دور دور سے شائقین اسکو دیکھنے کی غرض سے آتے تھے۔ اور یورپ تک اس مکان کی شہرت تھی، اس زمانہ

میں حیدرآباد میں اسکی مثل کوئی ایسی عالیشان سجی ہوئی عمارت نہیں تھی"۔ صہ ۹ (صحیفہ آسمانجاہی)۔

(۵) پنڈت رتن ناتھ سرشار اگرچہ سرشار حیدرآباد کے نہیں تھے بلکہ کشمیر کے باشندہ تھے لیکن ملازمت کے سلسلہ میں ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد آگئے اور یہاں ہی ۱۹۰۲ء میں انکا انتقال ہوا۔ اس لحاظ سے حیدرآباد کے ادیبوں میں انکا تذکرہ کرنا مناسب نہیں ہے۔

پنڈت سرشار کے ادبی خدمات کی تفصیل ہمارے مختصر صفحات میں دشوار ہے۔ انھوں نے "فسانہ آزاد" لکھکر دنیائے اردو میں اپنا سکہ بٹھادیا اور جب تک اردو زبان باقی ہے اسوقت تک سرشار کا نام بھی تاریخ اردو میں سنہرے حروف میں ثبت رہیگا۔

سرشار ایک نہایت خوشگو شاعر بھی تھے اور مزاحیہ نگار نثار بھی ان کے حسب ذیل تصانیف بہت مشہور ہیں:-

فسانہ آزاد، سیر کوہسار، جام سرشار، کامنی، خدائی فوجدار، کرام دھم بچھڑی دلہن، ہشو، طوفان بے تمیزی، رنگیلے سیاں، پی کہاں، شمس الضحیٰ وغیرہ ان میں سے بعض حیدرآباد میں تصنیف ہوئی ہیں۔ سرشار کی کردار نگاری مشہور ہے، اگرچہ وہ اصلیت کے ساتھ مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔

سرشار کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

"لوگوں نے سمجھا کہ صاحب ابھی بندرگاہ تو آنے دیجئے۔ بی شتاب جان اور کرم بخش یہاں سے کیونکر سن لینگی۔ کہا اجی ہٹو بھی تم کیا جانو کبھی کسی پر دل آیا تو سمجھو۔ ارے نادان عشق کے کان دو کوس تک کی خبر لاتے ہیں، اور کون کوس کڑی منزل

کے کوس، کیا شتاب جان نے آواز نہ سنی ہوگی، واہ بھلا کوئی بات ہے، مگر جواب کیوں نہ دیا۔ یہ پوچھو اس میں ایک لم ہے۔ پوچھو وہ کیا وہ یہ کہ معشوق پن تھیں اگر اتنی کچی نہ ہو۔ اگر آواز کے ساتھ ہی آواز کا جواب دیں تو بندے کی نظروں سے گر جائیں۔ مزا جب ہے کہ ہم بوکھلائے ہوئے ادھر ادھر ڈھونڈتے اور آوازیں دیتے ہوں کہ بی شتاب جان صاحب اجی بی صاحب اور وہ بے خبری میں پیچھے سے ایک دھول جمائیں اور تنک کر کہیں مونڈی کاٹا آنکھوں کا اندھا نام نیں سکھ غل مچاتا پھرتا ہے۔"

(۶) درد

رگھوناتھ راؤ "درد" بھی اس دور کے شاعر ہیں، زیادہ دوہرے نظم لکھا کرتے، افسانہ نگاری سے بھی دلچسپی تھی، رسالہ "تاج" کے نائب مدیر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔

درد کا وطن بیدر تھا جہاں وہ ۱۱ر اکٹوبر ۱۸۹۱ء کو تولد ہوئے انکے بچپن میں والد کا انتقال ہوگیا، حیدرآباد آکر ماموں کے زیر پرورش رہے، اردو فارسی کی تعلیم پائی وکالت کا بھی امتحان دیا۔ مطالعہ کا ذوق تھا اردو کے مشاہیر مولانا نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد اور سرشار کی کتابوں کو شوق سے دیکھا کرتے رہے، اس سلسلہ میں رسالہ تاج اور ادیب الاطفال کے ایڈیٹر کے اصرار پر مضمون نویسی شروع کر دی ساتھ ساتھ افسانہ نگاری کرتے رہے "بیدر گزٹ" کی ایڈیٹری بھی کچھ عرصہ تک کرتے رہے۔

ثمرۂ محنت، یتیم کی عید، بیوہ کی عید، صدائے بیکس، پیکر وفا، تازیانہ عبرت، ظہور قدرت، سچا محسن، نیرنگی دہر وغیرہ انکے مشہور افسانے ہیں۔

افسوس ہے کہ انکا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا، اور اس سے زیادہ

افسوسناک یہ امر ہے کہ بجز دو تین افسانوں کے باقی افسانے ہمدست بھی نہیں ہوتے
درد کے افسانے طبع زاد ہیں انکے افسانوں میں رنج والم زیادہ ہے ۔

"ہیرا سنگھ نے جوے اور شراب خواری کی لت سے چوری کرنیکا پیشہ اختیار کیا اسکا ساتھی امر سنگھ اچکا تھا، ہیرا سنگھ گو طبعاً نیک تھا مگر امر سنگھ کی صحبت کا اثر یہ ہوا کہ یہ بھی پکا جواری اور چور بن گیا پھر شراب کی عادت پڑ گئی، گھر سے چار چار روز غائب رہنے لگا گھر میں بیوی اور ایک شیر خوار بچہ دو تھے ۔ اگر دل میں آیا روپیہ دو روپیہ گھر میں دیدیا ورنہ چلتا پھرتا نظر آیا بیوی (درو پدی) کرتی تو کیا کرتی اگر کچھ چوں چرا کرتی تو لاٹھی یا جوتی سے مدارات کیجاتی ۔

فاقے پر فاقے گزرتے تھے لیکن صبر و شکر کے ساتھ زندگی کے دن کاٹ رہی تھی، محنت مزدوری اسوقت ممکن ہے جب کہ پیٹ میں کچھ ہو، جہاں تین تین دن کے فاقے گزرتے ہوں وہاں کیا ہو سکتا ہے ۔

چھوٹا دیال بیمار ہو گیا، ماں کے کلیجہ پر سانپ لوٹنے لگا کوئی پرسان حال نہیں اسکے لئے دنیا تاریک تھی، بیمار کیلئے حکیم اور دوا کی ضرورت تھی لیکن انکے بھینٹ چڑھانے کیلئے یہاں کچھ بھی نہ تھا"

(۷) رائے بیجناتھ بیجناتھ صاحب شمالی ہند کے باشندہ تھے مگر سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں حیدرآباد آکر بس گئے اور مرتے دم تک حیدرآباد میں رہے، آپ کا تعلق سررشتہ قانون سازی سے رہا اسکے علاوہ آپ لا کلاس (قانونی جماعت) کو سالہا سال تعلیم دیتے رہے، اس طرح

آپ کے شاگردوں کی تعداد حیدرآباد کے تمام اضلاع میں پھیلی ہوئی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے لئے آپ نے کئی کتابوں کا ترجمہ کیا اسکے علاوہ اکثر قانونی کتابیں تالیف کی، جامعہ عثمانیہ کے قانونی کالج میں لکچر دیتے رہے، کئی کتابوں کے مولف ہیں آپ کی نثر کا نمونہ پیش ہے۔

"دہرم شاستر[1] کے مضمون کی اہمیت اور قانون پیشہ حضرات کے لئے اوسکی ضرورت محتاج بیان نہیں ہے۔ اس مضمون پر اصل کتابیں تو سنسکرت زبان میں ہیں لیکن بہت کم قانون پیشہ حضرات ایسے ہیں جو اصلی کتابوں کا مطالعہ فرما سکتے ہیں، یا جنکو اسقدر فرصت ہے کہ اُن سے ضرورت کے وقت کسی نزاعی مسئلہ کے متعلق صحیح اصول اخذ کرسکیں۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ انگریزی زبان میں بالخصوص ٹیگور لکچروں کے ذریعہ بہت کافی سامان مہیا ہوگیا ہے لیکن اردو زبان میں اب تک کوئی ایسی کتاب میرے دیکھنے میں نہیں آئی جس سے طلبا اور نیز قانون پیشہ حضرات کی عملی ضرورتیں پوری ہوسکیں۔"

---

[1] دھرم شاستر مطبوعہ ۱۹۱۶ء۔

ساتواں دور

۱۳۳۶ھ ۱۹۱۷ء تا ۱۳۷۴ھ ۱۹۵۵ء

جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے ہمارا ساتواں دور ۱۹۱۸ء سے شروع ہوتا ہے جبکہ جامعہ عثمانیہ کا منشور خسروی (رائل چارٹر) شائع ہوا، اس دور کے شعرا کا تذکرہ آپ پڑھ چکے ہیں، جن میں سے بعض جامعہ عثمانیہ سے تعلق رکھنے والے شعرا ہیں اور دوسرے وہ ہیں جنکو جامعہ سے تعلق نہیں ہے، اسی طرح نثر نگاروں کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ ہیں جن کو جامعہ عثمانیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور دوسرے فرزندان جامعہ۔

اس موقع پر ہمارا فریضہ ہے کہ ان اصحاب کو فراموش نہ کریں جنہوں نے جامعہ عثمانیہ کو قائم کرنے یا دوسرے الفاظ میں حیدرآباد کی تعلیمی بیداری میں حصہ لیا ہے، حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے ذریعہ اپنی آواز بلند کی ہے اور ہندو مسلمانوں نے ملکی تعلیمی جدوجہد میں حصہ لیا ہے اور اس کے بعد سیاسی بیداری کیجانب متوجہ ہوئے، ان اصحاب نے اپنی سیاسی جدوجہد میں دوسری زبانوں کے ساتھ اردو کو بھی اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا تھا اگرچہ ان میں سے بڑا حصہ آج دنیا سے کوچ کر گیا ہے مگر انکے کارنامے باقی ہیں، اس موقع پر ہم ان میں سے چوٹی کے ہستیوں یعنی صف اول میں آنے والے اصحاب کا تعارف کراتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:-

(۱) شریمتی سروجنی نائیڈو (۲) بابو گیا پرشاد (۳) پنڈت کیشو راؤ۔
(۴) وامن نایک صاحب (۵) رائے بال مکند صاحب (۶) رامچندر نایک صاحب

(۷) راما چاری صاحب (۸) ہز اکسلنسی بی رام کشن راؤ صاحب (۹) مادوپتی ہنمنت راؤ صاحب (۱۰) کاشی ناتھ صاحب ویدیہ (۱۱) سری کشن صاحب (۱۲) ونکر صاحب وغیرہم۔

(۱) شریمتی سروجنی نائیڈو

اولاً ہم بلبل دکن مسز سروجنی نائیڈو کا تذکرہ کرینگے۔ آپ کی ولادت حیدرآباد میں ہوئی اور یہاں ہی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ آپ کو اپنے وطن حیدرآباد سے جسقدر محبت تھی اسکا اظہار اس موقع پر ضروری نہیں ہے۔ اردو زبان سے آپ کو پوری دلچسپی تھی آپ کے مہمانوں میں اکثر اردو کے شعرا اور مصنفین شامل رہتے تھے۔ انکے کلام سے آپ بیحد محظوظ ہوتی تھیں۔ اقبال، جوش، حفیظ، امجد وغیرہ کے کلام کی آپ پوری قدر فرماتی تھیں آپ نے اردو میں بھی تقریریں فرمائی ہیں آپ کی سب سے پہلی اردو تقریر حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے سالانہ جلسہ میں اسکی آخری تحریک کے متعلق ہوئی تھی اس کے بعد بھی کانگریس کے اجلاس اور دوسرے سیاسی جلسوں میں اردو میں تقریر فرمائی ہیں۔ آزادی کے بعد آپ یوپی کی گورنر ہوئیں اور اسی عہدہ پر آپ کا انتقال ہوا۔ نثر کا نمونہ:۔

"میں پہلی مرتبہ اتنے بڑے مجمع میں اردو تقریر کر رہی ہوں اور حاضرین کو امید نہ رکھنی چاہیے کہ میں کوئی فصیح و بلیغ تقریر کرسکوں گی میرے والد کا ارادہ بھی اس قسم کے کانفرنس کے قیام کا تھا جو اب انکی وفات کے بعد قائم ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے اس غم میں جو انکی وفات کی وجہ سے میرے دل پر ٹوٹ پڑا ہے میری تسلی ہوئی ہے۔"

بانیاں کانفرنس نے اس کانفرنس کے قیام سے بڑی جرأت
و ایثار کا نمونہ پیش کیا ہے۔ اب جو رزولیوشن پیش ہے اس سے
انکے اصلی کام کی ابتدا ہوتی ہے۔ اسوقت کانفرنس کا بیج
بویا جارہا ہے۔ بیج کا بونا آسان ہے۔ مگر اسکے پھل آنے میں
بہت محنت اور عرصہ لگتا ہے۔ اسی طرح کانفرنس کے نتائج
بھی برآمد ہونے کیلئے سچی کوشش اور محنت کی ضرورت ہے۔ انہیں
کانفرنس کے مقاصد عمل میں لانے کیلئے بہت سے مشکلات کا
سامنا ہوگا۔ اور انکو لوگوں کے اعتراضات کا نشانہ بننا پڑیگا
لیکن انکو چاہئے کہ صبر و استقلال سے کام کریں۔

صبر کن حافظ بسختی روز و شب
آخرش روزے بیابی کام را[۱]

(۲) بابو گیا پرشاد

مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم پائی تھی، منشی کا فارسی امتحان کامیاب کیا تھا پھر وکالت میں کامیابی حاصل کرکے وکالت کرتے تھے، حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس سے بڑی ہمدردی تھی، ابتدائے قیام سے اس سے دلچسپی لیتے تھے، کانفرنس کے پہلے اجلاس میں ایک تحریک یہ پیش ہوئی تھی اردو تصنیف و تالیف کے لئے سرکار سے امداد مقرر کیجائے۔ گویا یہ دارالترجمہ کی قیام کا پیش خیمہ تھا اس تحریک کی تائید بابو گیا پرشاد صاحب نے نہایت پرزور طریقہ سے فرمائی آپ نے اپنی تقریر کے دوران میں فرمایا:۔

---

[۱] روئداد کانفرنس سال اول ص۲۱۔

"اردو زبان ہندوستان خصوصاً ممالک محروسہ سرکار عالی کے لئے ایک اہم زبان ہے، ممالک محروسہ میں تلنگی، مرہٹی اور کنڑی مقامی زبانیں ہیں، اور یہ تینوں زبانیں کسی طرح اردو کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہیں۔ اردو ممالک محروسہ سرکار عالی کی سرکاری زبان ہے اور اسکی دیگر خصوصیات میں اسکا وہ جلد لکھا جاسکنا بہ مقابلہ دوسری زبانوں کے ایک ایسی خصوصیت ہے جو حالات زمانہ کے اعتبار سے نہایت اہمیت رکھتی ہے، میرے دوست مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی تحریک کو صرف بارہ ہزار روپے تک محدود کیا ہے۔ لیکن اردو زبان کی ترقی کیلئے جو کام کرنا ہے اسکے لئے یہ رقم ہرگز کافی نہیں ہوسکتی اور چونکہ وسعت زبان اردو سے بہ مقابلہ دیگر حصص ہند کے زیادہ فائدہ سرکار عالی اور باشندگان ممالک محروسہ سرکار عالی کو پہنچے گا اسلئے میری رائے میں سرکار عالی سے مودبانہ یہ درخواست کی جانی چاہیے کہ بارہ ہزار روپیہ سالانہ اور اس سے زیادہ جسقدر رقم کی ضرورت ہے امداد کا دیا جانا منظور فرمائے۔
(روئداد کانفرنس سال اول ص۲)

یہ تحریک کانفرنس میں بہ اتفاق منظور ہوئی اور سرکار عالی نے اس کو منظور کر لیا اور اس سلسلے میں نصاب مدارس کی کتابوں کے ترجمہ کا کام انجمن ترقی اردو کے تفویض کیا گیا۔

(۳) پنڈت کیشو راؤ صاحب پہلے وکالت کرتے تھے اور پھر ہائی کورٹ کے جج بنے، آپ کو بھی اردو زبان سے پوری دلچسپی تھی، "دکن لا رپورٹ" کے عرصہ تک اڈیٹر رہے، حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

سے بڑی دلچسپی لیتے تھے کانفرنس کے دوسرے سالانہ جلسہ میں جو بمقام اورنگ آباد ہوا تھا حسب ذیل تحریک آپ نے پیش فرمائی تھی۔

"کانفرنس سرکارعالی کا شکریہ ادا کرتی ہے کہ اس نے اردو میں علمی تراجم وتصانیف کی اشاعت کیلئے کانفرنس کی تحریک پر توجہ فرمائی کانفرنس نہایت ادب کے ساتھ اس امر پر توجہ دلاتی ہے کہ جو رقم فی الحال سرکارعالی سے بطور امداد ترقی علم دیجاتی ہے اسکا بہت قلیل حصہ اس مقصد یعنی اردو زبان میں تراجم وتصانیف علمی کی اشاعت میں صرف ہوتا ہے، جو ضروریات ملک کے لحاظ سے بالکل غیر مکتفی ہے اور اس کے مکرر کانفرنس سرکار کی توجہ اس کام کی خاص امداد کیلئے مبذول کراتی ہے۔"

پنڈت کیشوراؤ صاحب نے نہایت مدلل طور پر اس تحریک کو پیش کرتے ہوئے جو تقریر فرمائی تھی اس میں کہا تھا۔

"اس رزولیوشن میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ کوئی جدید خیالات نہیں، یہ کام ہر مہذب ملک میں ہوا ہے اور ہورہا ہے .... دنیا کا تمام علم کسی ایک زبان میں بھرا ہوا نہیں ہے۔ ہر ملک میں اپنے اپنے زبان میں علم کا ذخیرہ لوگوں نے جمع کیا ہے .... اگر اس ملک کو اس ذریعہ سے فائدہ پہنچانا مقصود ہے تو اس میں شک نہیں ہے کہ علاوہ اردو زبان کے دوسری زبان میں بھی کتابوں کے ترجمہ کی ضرورت ہے ...... لیکن موجودہ عطیہ صرف اردو کیلئے ہی کافی نہیں ہے۔ جب گورنمنٹ رقم میں اضافہ کریگی اور پبلک بھی کچھ امداد کریگی اسوقت دوسری

زبانوں میں بھی ترجمہ کرنے کا کام شروع کیا جائیگا۔" (روئداد کانفرنس سال دوم صـ۶۴ـ)۔

(۴) وامن نائک صاحب — وامن رامچندر نائک صاحب کو حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے ابتدائے قیام سے دلچسپی تھی آپ اس کے سرگرم رکن تھے، دامے، درمے مدد کرتے تھے، کانفرنس کے اجلاسوں میں پرزور تقریر کرکے حاضرین کو گرماتے تھے۔ قیام یونیورسٹی (جامعہ عثمانیہ) کے لئے جو تحریک آپ نے پیش کی تھی اس میں کہا تھا۔

"عام طور پر ابتدائی تعلیم اردو میں لازمی قرار دیگئی ہے اسلئے متعلق آپ یہ خیال نہ کریں اور اس سے کوئی غلط فہمی نہ ہو کہ میں زبان اردو کے خلاف میں ہوں میرا خیال یہ ہے کہ تمام ہندوستان میں اگر کوئی ایک زبان سمجھے جانے کے قابل ہے تو وہ ہندی یا اردو ہے یعنی جسکو انگریزی میں لنگوا فرانکا کہتے ہیں، یہ عزت سوائے ہندی یا اردو کے اور زبان کو نہیں ہے ....

اب یہ امر غور طلب ہے کہ ہمارا تعلق بمبئی یونیورسٹی سے کیا جائے یا ہمارے لئے ایک علحدہ یونیورسٹی ہمارے ملک میں قائم کیجائے میری رائے میں علحدہ نظام یونیورسٹی یہاں قائم ہونا زیادہ تر مفید ہے"

کانفرنس کے تیسرے سالانہ جلسہ میں حسب ذیل تحریک ہوئی تھی۔

"اس کانفرنس کی رائے میں سررشتہ تالیف و ترجمہ کے ذریعے علوم شرقیہ کیلئے بھی انکے اصلی ماخذوں سے اردو میں ترجمہ و تالیف

لہ روئداد کانفرنس سال دوم (صـ۱۰۰ تا صـ۱۰۱)۔

کا انتظام ہونا چاہئے"۔

اس تحریک کی تائید میں وامن نائک صاحب نے جو تقریر فرمائی تھی اسکا اقتباس یہ ہے۔

"میں اسوقت صرف چند لفظ اس تحریک کے متعلق عرض کرونگا میں اس لئے کھڑا ہوا ہوں کہ ہندؤں کی طرف سے بھی اس کی تائید کروں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے متعلق جسکے لئے سررشتہ ترجمہ قائم ہوا ہے۔ چند مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ اس سے ہندو الگ ہیں، مگر میں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ خیال بالکل غلط ہے ہندو ہرگز عثمانیہ یونیورسٹی کے خلاف نہیں ہیں اور انکو اس سے کچھ وجہ اختلاف نہیں ہے۔ اگر علوم و فنون اردو میں پڑھائے جائینگے تو اس کا فائدہ سب کو عام ہوگا۔ بمبئی کے ایک پروفیسر نے تحریک کی تھی کہ ہر ہر زبان کی ایک یونیورسٹی بننی چاہئے۔ پس اس کا ایک شعبہ گویا یہ اردو یونیورسٹی ہے[1]"۔

(۵) نارائن جی ونگر

آپ کی زبان مادری اردو نہیں تھی، جب حیدرآباد میں سررشتہ تعلیمات میں ایک اعلیٰ خدمت پر مامور ہوکر آئے تو بہت جلد اردو میں مہارت پیدا کرلی۔ یہانتک کہ کانفرنس میں اردو میں تقریر کرتے تھے۔ آپ نے کئی اجلاسوں میں شرکت کرکے تحریکیں پیش فرمائی اور تائید فرمائی تھی۔ چنانچہ کانفرنس کے دوسرے سالانہ جلسہ میں آپنے اپنے تقریر کی ابتدا حسب ذیل الفاظ میں کی تھی۔

---

[1] روئداد کانفرنس اجلاس سوم ص ۵۶

"پیشتر اس لحاظ سے کہ یہاں اورنگ آباد میں مرہٹی جاننے والے اشخاص اغراض و مقاصد کانفرنس سے پوری طرح واقف ہوں قرار پایا تھا کہ میں مرہٹی میں تقریر کروں۔ لیکن چونکہ حاضرین میں قریب قریب کل حصہ ایسا ہے جو اردو بخوبی سمجھ سکتا ہے اور اسکے برخلاف اگر مرہٹی میں تقریر کیجائے تو بڑا حصہ اس سے ناواقف رہیگا۔ اسلئے میں اردو میں تقریر کرونگا۔ جسکو سمجھنے میں حاضرین کو کوئی دقت نہ ہوگی اور یہ ایک علامت اس امر کی بھی ہے کہ اگر کوئی زبان ہندوستان کی عام زبان ہوسکتی ہے تو وہ اردو ہی ہے"[1]

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے متعلق آپ نے جو خیالات ظاہر کئے تھے اس میں کہا تھا کہ

"بجائے اس طور سے انتظام کرنیکے اس لحاظ سے ایک دن ہماری یونیورسٹی ضرور ہوگی فی الحال موجودہ حالت علی حالہ رکھکر اس امر میں ہم اپنی پوری کوشش کیوں صرف نہ کریں کہ یونیورسٹی بننے کا مواد جلد مہیا کیا جائے"[2]

(۶) رائے بالمکند صاحب آپ کو عرصہ دراز سے تعلیمی اور سماجی کاموں سے دلچسپی تھی، جب حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس قائم ہوئی تو آپ اسکے بھی سرگرم ممبر بن گئے، کانفرنس کے اجلاس میں شریک ہوتے اور اپنی ہمدردی کا عملی ثبوت دیتے تھے۔

(۷) رامچندر نانک ضلع محبوب نگر کے ایک معزز جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انگلستان سے یم اے یل یل ڈی

[1،2] روئداد کانفرنس سال دوم صہ ۲۶ و صہ ۱۱ -

اور بالسٹری کی ڈگریاں حاصل کیں۔ حیدرآباد آکر اولاً وکالت کرتے رہے' اور جلد شہرت حاصل کرلی' پھر ہائیکورٹ کے جج بنائے گئے' پچپن سالہ عمر پر وظیفہ پر علٰحدہ کئے گئے' مگر پولس ایکشن کے بعد پھر آپ کو چیف جسٹس بنایا گیا اور اس کے بعد دوبارہ سبکدوشی حاصل کی۔ سماجی خدمات میں حصہ لیتے رہے' اور اس حیثیت سے بھی شہرت حاصل کی۔ ۱۹۵۵ء میں علاج کے لئے یورپ گئے وہاں ہی انتقال ہوا۔ لاش کو انگلستان میں جلایا گیا اور راکھ حیدرآباد لائی گئی نانک صاحب اکثر و بیشتر اردو میں تقریر فرماتے تھے' تعلیمی اور سیاسی دونو اداروں سے تعلق تھا۔ آپ کی نثر کا نمونہ پیش ہے' حیدرآباد کی پہلی سیاسی کانفرنس "اکولہ" کی آپ نے صدارت کی انکی عبارت کا نمونہ یہ ہے۔

"ہر شخص کا دلی رجحان اور ہر شخص کیلئے مواقع مختلف ہوتے ہیں اور اگر ریاست کا ہر باشندہ اپنے اپنے طور پر ریاست کی خدمت کرے تو ریاست کا مجموعی طور پر بہت بڑا فائدہ ہوگا اور ملک لازماً ترقی کریگا۔ ہم کو چاہئے کہ ملک کی خدمت کیلئے ہر فرد و ہر قوت کو کام میں لائیں۔ میں اپنے ابنائے وطن سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ حسد و نفسانیت کو ترک کریں اور آپس میں وہ اتحاد و اتفاق قائم رکھیں۔ جس پر حیدرآباد کو آج فخر رہا ہے۔ اور ملک کو مضر رسومات و رواجات سے پاک کریں اور ایک دوسرے کو مساوات کی نظر سے دیکھیں کسی فرقہ کی تحقیر اور نہ کسی فرقہ کے ساتھ ظلم و زیادتی کو روا رکھا جائے بلکہ سب متحد ہو کر ملک کی ترقی اور ملک کی نیک نامی کیلئے کوشاں رہیں۔" (خطبہ صدارت حیدرآباد کی سیاسی کانفرنس ۱۹۳۱ء)۔

(۸) ہز اکسلنسی بی رام کشن راؤ ہز اکسلنسی بی رام کشن راؤ ضلع محبوب نگر کے ایک قصبہ بورگل کے سپوت ہیں

بورگل کی وطن داری اور مقطعہ داری آپ کے خاندان میں صدیوں سے چلی آتی ہے' آپ کی تعلیم حیدرآباد اور پونہ میں ہوئی کالج کی تعلیم اولاً نظام کالج میں ہوئی فارسی اختیاری زبان تھی' فارسی کی تعلیم آپ نے مولانا جمال الدین نوری اور داعی اسلام آقا سید محمد علی جیسے مسلم الثبوت اساتذہ سے حاصل کی۔ پونہ میں فرگوسن کالج سے استفادہ کیا بی اے اور ایل ایل بی کے امتحانات میں کامیابی حاصل کرکے وکالت شروع کی سررشتہ مالگذاری اور عطیات کے مقدمات میں آپ کو خصوصیت حاصل رہی۔

تعلیمی اور سیاسی کاموں سے دلچسپی زمانہ تعلیم ہی سے رہی اور جب تعلیم ختم کرکے میدان عمل میں آئے تو اپنی پوری توانائیاں اور توجہ ان امور کی جانب مبذول کردیں آپ کی سیاسی کارگزاریوں کی صراحت یہاں طوالت کی موجب ہے اسلئے نظر انداز کی جاتی ہے' کامیاب لیڈر اور سچی محب وطن کے لئے سیاست کے جو مدارج ہیں صدارت' جیل خانہ' رہائی پھر سیاست سے دلچسپی اور ترقی سب مدارج آپ طے کرچکے ہیں۔ اولاً منسٹر اور بعد چیف منسٹر بنے اور کامیابی سے اپنے فرائض انجام دیے اور اب کرالا کے گورنر بنائے گئے ہیں۔

علمی کاموں سے آپ کو پوری دلچسپی اور شغف رہا۔ رباعیات عمر خیام کو تلنگی نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ کئی سیاسی اور علمی مقالہ قلمبند کئے ہیں' جو انگریزی تلنگی اور اردو زبانوں پر مشتمل ہیں۔ آپ کے انگریزی' فارسی' اردو اور تلنگی کے ادیب اور تلنگی کی شاعری میں آندھرا دیش بنانے میں آپ کا بڑا حصہ ہے اور بقول گورنر مدھیہ پردیش (ڈاکٹر پٹا بھی سیتا رمیا صاحب) "وشال آندھرا

کے خواب کی تعبیر میں ڈاکٹر بی رام کرشن راؤ کی خدمات کسی طرح کم اہم نہیں ہیں انکے قومی خدمات ناقابل فراموش ہیں"۔

اور بقول نیلم سنجیوا ریڈی چیف منسٹر آندھرا "آندھرا کے چار ستون ہیں جن میں سے ایک رام کرشنا راؤ اور دوسرے ماداپتی ہنمنت راؤ ہیں"۔ اردو نثر کا نمونہ پیش ہے

"زبان کی تاریخ انسانی تاریخ کی طرح بہت عجیب ہے، اور اسکا مطالعہ ایک عجیب فضا پیدا کرتا ہے۔ زبانیں ترقی بھی پاتی ہیں، اور ان میں تنزل بھی ہوتا ہے، تبدیلی بھی ہوتی ہے، ابھی اس ادارہ کے معتمد عمومی ڈاکٹر زور صاحب نے اپنی رپورٹ میں اردو کی ترقی کیلئے جو کام ہوتا رہا ہے اسکی تاریخ پر روشنی ڈالی آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے حیدرآباد میں یہ کام شروع ہوا، جیساکہ ہم سب جانتے ہیں کہ پہلے دہلی اردو کا مرکز تھا، بعد میں وہ مرکز لکھنو بن گیا اور پھر لکھنو کے بعد حیدرآباد میں اردو کی سرپرستی شروع ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اور زبانوں کی تاریخ کی طرح اردو زبان کی تاریخ بھی اس طرح شروع ہوئی کہ اس کی سرپرستی بادشاہوں اور امیروں کے گھروں میں ہوئی، لیکن آج زمانہ بدل گیا ہے[1]"۔

(۹) ماداپتی ہنمنت راؤ

ہنمنت راؤ صاحب آندھرا پردیش کے ایک ممتاز فرزند ہیں انکی زندگی کا بڑا حصہ ملک و قوم کی بھلائی میں بسر ہوا ہے ایک عرصہ تک وہ "مشیر دکن" کے ادارے

---

[1] سب رس جوبلی نمبر

قلمبند کرتے رہے، اور اخبار کا جو معیار قرار دیا تھا وہ ملک اور حکومت میں پسندیدہ خیال کیا جاتا رہا۔

آپ نے تلنگانہ میں بیسوں کتب خانے قائم کئے اور مدرسے بنائے اس وقت بھی کئی مدرسوں کی سکریٹری وغیرہ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ حکومت حیدرآباد کے قائم ہونے پر آپ کو بلدیہ کا "میر" چنا گیا کئی سال تک آپ نے اس اعزازی خدمت کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیکر خراج تحسین حاصل کیا۔

(۱۰) سی سری کشن

سری کشن صاحب رائے بالمکند صاحب کے فرزند ہیں جنکا تذکرہ قبل ازیں ہو چکا ہے، سری کشن صاحب حیدرآباد میں تولد ہوئے، یہاں تعلیم پائی، وکالت میں کامیاب ہو کر وکالت کرنے لگے، پھر انگلستان جاکر بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔

سری کشن صاحب کو تعلیم سے بھی دلچسپی رہی اور سیاست سے بھی۔ آپ شروع سے ان دونوں میدانوں میں حصہ لیتے رہے، آپ کی زندگی ان اصحاب کیلئے ایک نمونہ اور مثال ہے جو ملک وقوم کے خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ سری کشن صاحب ضعیف ہونیکے بعد بھی میدانِ عمل سے کنارہ کش نہیں ہوئے ہیں، ابتک بھی قوم اور ملک کی خدمت میں مصروف ہیں کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں "میری رخصت حیدرآباد سے" "میرا استعفا" "میری تادیبی کارروائی" وغیرہ۔ آپ کی زندگی ہندو مسلم اتحاد دکنی کلچر کا ایک مکمل نمونہ ہے، سری کشن صاحب نہ صرف خود کام کرنے والے ایک سچے محب وطن ہیں بلکہ انکی وجہ سے کئی اصحاب نے میدان عمل میں آکر نام آوری حاصل کی ہے۔ حیدرآباد کو تقسیم نہ کرنے کے متعلق آپ کی جدوجہد فراموش نہیں کیجا سکتی۔ آپ کی عبارت کا نمونہ

پیش ہے۔

"ملک کے معنی میں صرف ایک رقبہ جغرافیائی نہیں جو آج کل
برنگ زرد طلبہ کے درس کے لئے جغرافیائی کتب میں درج ہے
بلکہ اسکا خیال و تصور اس جذبہ و احساس پر مبنی ہے جسکی بناء
پر ایک زمانہ میں خدا کی توفیق سے مملکت آصفیہ کا تسلط ہندوستان
کے نصف حصہ پر رہا، اور جو آئندہ بہ افضال الٰہی اپنی کھوئی
ہوئی عظمت و سطوت کو حاصل اور اس میں دن دونی رات
چوگنی اضافہ کرنا چاہتی ہے، ملک کے ساتھ مالک و رعایا کی
ہم آہنگی ان دونوں کو بھی تصور میں لاتی ہے، تاریخی و تمدنی
روایات خانوادہ آصفی کے ساتھ رعایائے ملک دکن کے
جو تعلقات یکجہتی و محبت و عقیدت رہے ہیں، انکو ظاہر
کرتی اور تقویت دیتی ہیں، آصفجاہوں کے درخشاں زمانے
انکی اپنی رعایا پر مشفقانہ اور مربیانہ نظر خود رعایا کی وفاشعاری
ایثار نفسی۔ جاں نثاری خودداری بلند حوصلگی، ہمت و جوانمردی
ملک و مالک و رعایا کیلئے ہمیشہ باعث فخر و مباہات رہے
اور اسوقت بھی مشعل ہدایت کا کام دیتے ہیں کیونکہ استحکام
ملکی انکی وجہ سے ہے۔"[1]

(۱۱) جی راما چاری جی راما چاری کرناٹک (گلبرگہ) کے باشندہ تھے
وکالت آپ کا پیشہ تھا۔ سیاست میں بھی

---

[1] میری رخصت۔

دخیل رہے، حیدرآباد کی سیاست کے صف اول میں نمایاں مقام حاصل کیا تھا۔

جب عوامی حکومت کی بنیاد قائم کی گئی اور لائق علی وزارت سے آغاز ہوا تو راما چاری صاحب کو منسٹر بنایا گیا تھا، مگر حکومت کے بے اصول کارروائیوں کے مدنظر احتجاج کے طور پر آپ نے استعفا دیدیا، کانگریس کے سرگرم رکن تھے۔ آپ نے حیدرآباد کی سیاسی تحریک کا نہایت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ تصنیف و تالیف سے دلچسپی تھی "حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس کی تاریخ" کے نام سے ایک پمفلٹ شائع کیا ہے۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس کی ابتدا اوس پر امتناعی احکام ستیا گرہ وغیرہ کی پچھلی طویل تاریخ سے پبلک بخوبی واقف ہے ۱۹۳۸ء میں اسٹیٹ کانگریس کے ادارہ کی پوری تشکیل ہونے کے پیشتر ہی اسکو خلاف قانون انجمن قرار دیکر حکومت نے اس تحریک کو دبانے کی کوشش کی۔ حیدرآباد کی سیاسی زندگی میں اس ادارہ کی تشکیل کو ایک خاص اہمیت اس وجہ سے حاصل تھی کہ اسکے پیشتر قومیت پسندانہ اصولوں کی اساس پر ملک کے مختلف جماعتوں کی سیاسی انجمن بنانے کی جتنی کوششیں کی گئی تھیں وہ ساری کوششیں باوجود کوشش کرنے والے احباب اور دیگر اہل الرائے اصحاب کی صداقت اور عزم و استقلال کے ناکام ہوچکی تھیں"۔[۱]

---

[۱] تاریخ حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس ص ۱ و ۲۔

(۱۲) کاشی ناتھ راؤ ویدیہ ویدیہ صاحب مہاراشٹر کے علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں، حیدرآباد میں آپ کی بودوباش رہی، بی اے ایل ایل بی کی کامیابی کے بعد حیدرآباد میں وکالت شروع کی۔ اور حیدرآباد کے سربرآوردہ وکلاء میں آپکا شمار ہوتا ہے حکومت آصفیہ کے پاس بھی آپ کا اعزاز تھا اور عوام میں بھی مقبول ہیں۔ عوام کے تعلیمی اور سیاسی امور میں حصہ لیتے رہے، اور پوری توجہ اور دلچسپی سے عوام کی خدمت میں مصروف و منہمک رہے۔

پولیس ایکشن کے بعد جب حیدرآباد میں عوامی حکومت قائم ہوئی تو آپ کا انتخاب بیگم بازار کے وسیع حلقہ سے ہوا، اور اسکے بعد اسپیکر کی حیثیت سے آپ کا انتخاب عمل میں آیا۔ اور حیدرآباد کی تقسیم تک آپ اس اہم خدمت کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے، تاریخ آزادی ہند کی کمیٹی کے آپ صدر تھے۔

علمی کاموں سے پوری دلچسپی رہی ادارہ ادبیات اردو کے چہل سالہ جوبلی کے سلسلہ میں اسکے ایک اجلاس کی بھی صدارت فرمائی، آپ کی اردو عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ زبان کے معاملہ میں مذہب کا کوئی تعلق نہیں ہے، مرہٹی زبان کا ٹھیکہ صرف ہندوؤں نے ہی نہیں لیا نہ مسلمانوں نے اردو بولنے کا ٹھیکہ لیا ہے، جس طرح کوئی آدمی کسی رقبہ میں پیدا ہو تو وہ اس خطہ کا سمجھا جائیگا چاہے اسکا مذہب کچھ بھی ہو، لیکن حال حال میں کچھ ایسی باتیں پیدا ہو گئی ہیں کہ ہر چیز کا تعلق مذہب سے ہو گیا ہے، کوئی

خطہ ہو، ریاست ہو یا زبان اسکو اپنے ہی دائرے میں کھینچ لیتے ہیں، کوئی آدمی کسی خطہ میں پیدا ہو تو اس خطہ سے موسوم ہوگا مثلاً اگر کوئی مسلمان مرہٹواڑے میں پیدا ہو تو مرہٹواڑہ کا مسلمان کہلایا جائیگا۔ میں نے سنا ہے کہ یہاں سے جو لوگ حج کرنے کے لئے عربستان جاتے ہیں تو وہاں کے لوگ یہاں کے مسلمانوں کو ہندی مسلمان کہتے ہیں۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ اپنے وطن کا کوئی آدمی کسی دوسری جگہ مل جائے تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ میں زمانہ سے حیدرآباد میں رہتا ہوں لیکن میرا وطن اورنگ آباد ہے۔ وہاں کا کوئی آدمی ملجائے تو خوشی ہوتی ہے[1]۔"

(۱۳) کے وی رنگا ریڈی

کے وی رنگا ریڈی صاحب ریڈی قوم کے ایک بلند مرتبہ لیڈر ہیں تلنگی، اردو، فارسی، انگریزی سے واقف ہیں، خصوصیت سے اردو سے شغف ہے عوامی حکومت نے منسٹری کی خدمت آپ کو پیش کی جسکو آپ بحسن و خوبی انجام دیتے رہے ہیں سررشتہ مالگذاری وغیرہ آپ کے تفویض تھے، ان دفاتر میں دفتری کاموں کیلئے اردو کو آپ نے باقی رکھا ہے، دوسرے دفاتر کی طرح اردو کو خارج نہیں فرمایا۔

رنگا ریڈی صاحب ایک انصاف پسند وزیر ہیں۔ اونہوں نے بلا لحاظ مذہب انصاف کو اپنا نصب العین بنایا ہے آپ کے اردو مضامین اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔ اب امور داخلہ آپ سے متعلق ہے۔ نمونہ عبارت:—

"اس چھوٹی سی کتاب میں وطندار کے دکھوں کو اصلی شکل میں

---

[1] سب رس جوبلی نمبر

مگر شاعرانہ انداز میں ظاہر کرنے کی قابلیت سے کوشش کیگئی ہے صیحح واقعات کے ظاہر کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی گئی۔ زبان سلیس اور عبارت میں روانی ہے اور مضامین معلومات سے پُر ہیں۔ ضمیمہ میں جن احکام کا حوالہ ہے وہ مکمل نہیں ہے۔ اس خصوص میں احکام اس کے علاوہ اور بھی ہیں، اس مختصر کتاب کے پڑھنے سے ہر شخص دلمنداروں کے دکھوں سے کافی واقفیت حاصل کرسکتا ہے، مسٹر دی کے ریڈی کی یہ پہلی تصنیف ہے اور انکا طالب علمی کا زمانہ ہنوز ختم نہیں ہوا ہے۔ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ تصنیف آیندہ ریڈی صاحب کیلئے ہمدرد عوام اور اردو کی دنیا میں اعلیٰ پایہ شاعر ہونے کا ایک پیش خیمہ ہے[1]۔"

ایک دوسری نثر کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو۔

"تنظیم جدید سے قبل ہندوستانی ریاستوں کا جو ڈھانچہ تھا وہ ایک تو اتفاقی اور دوسرا ملک میں برطانوی راج کی ترقی سے وابستہ حالات کا نتیجہ تھا، اور اس نقشہ کو سب سے پہلے تو بعض دیسی ریاستوں کے انضمام کے ذریعہ تبدیل کیا گیا اور اس طرح ایک بہت بڑے معاملہ کی یکسوئی کی گئی۔ یہ ممکن ہے کہ اگر ایک صدی قبل ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد مہاراجاؤں اور راجاؤں کی ریاستوں کو ضم کرنے کی برطانوی پالیسی کو ترک نہ کیا جاتا۔ تو نہ تو دیسی ریاستوں کے مستقبل ہی کا سوال پیدا ہوتا، اور نہ ہی زیادہ

---

[1] پیش لفظ دکھنی دلمندار

عقلی اور سائنسی بنیادوں پر ہندوستان کی تنظیم جدید کی ضرورت لاحق ہوتی۔" (رہنما یکم نومبر ۱۹۵۶ء)۔

(۱۴) یم نرسنگ راؤ مسٹر یم نرسنگ راؤ نہ صرف سیاست بلکہ دنیائے اردو میں اچھی شہرت رکھتے ہیں، ضلع محبوبنگر کے دیسکھہ میں آپ کا خاندان سیکڑوں سال سے اس خدمت کو انجام دیتا آرہا ہے، قطب شاہی دور اور عالمگیری عہد کے پروانے آپ کی معاش کی تصدیق کرتے ہیں۔

یم نرسنگ راؤ کی ابتدائی تعلیم حسب رواج خاندان گھر پر ہوئی اردو فارسی کی تعلیم پاکر مدرسہ دارالعلوم میں شریک ہوئے اور یہاں سے فارسی کے امتحانات منشی اور دبیر میں کامیابی حاصل کی پھر عثمانیہ یونیورسٹی کے قائم ہونے کے پیشتر جو انگریزی تعلیم کیلئے دارالعلوم میں خاص انگریزی تعلیم کی جماعت قائم ہوئی تھی اس میں شرکت کی۔ انگریزی تعلیم کے بعد وکالت کا امتحان دیا اور وکالت شروع کی۔ چند سال تک وکالت کرکے اسکو اپنی طبیعت کے موافق نہ پاکر ترک کردیا اور ایک ہفتہ وار اخبار "رعیت" شائع کرنے لگے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس اخبار نے روزانہ اخبار کی صورت اختیار کرلی۔ چند سال تک یہ بند رہا اور پھر ہفتہ وار اخبار کی صورت میں شائع ہوتا تھا۔

یم نرسنگ راؤ صاحب ایک اچھے ادیب اور انشا پرداز ہیں آپ کے سیاسی، اصلاحی، تعلیمی، معاشرتی مضمون ہر آئینہ قابل قدر ہوتے ہیں۔ آسان عام فہم زبان میں اپنے خیالات کو ظاہر کرتے ہیں، ان میں روانی اور شگفتگی ہوتی ہے۔ اور پر اثر ہوتے ہیں، اب آندھرا پردیش کی منسٹری پر مامور ہیں، بہادر یار جنگ سے سیاسی امور کے متعلق ہندو مسلم اتحاد کے سلسلہ میں آپنے بڑی جدوجہد فرمائی تھی، اگر بہادر یار جنگ کی زندگی وفا کرتی تو دونوں میں پورا

تعاون ہو جاتا۔ اسوقت حکومت آندھرا پردیش میں منسٹری کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ آندھرا پردیش کی بڑی توقعات آپ سے وابستہ ہیں، عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"امن کے اٹھارہ سال بعد دنیا کے سامنے آج جنگ کا وہی نقشہ پیش ہے، جو آج سے تقریباً (۲۲) سال قبل تھا، مدبرین یورپ کے سامنے پھر آج وہی سوال پیش ہے جو آج سے تقریباً (۲۲) سال قبل پیش تھا۔

جنگ عظیم کے اختتام کے بعد حکومت امریکہ کے صدر ولسن نے اپنے مشہور و معروف (۱۴) اصول پیش کر کے دنیا میں آیندہ جنگ عظیم کے امکانات کی بیخ کنی کرنے کی کوشش کی، جس کے نتیجہ کے طور پر لیگ اقوام وجود میں آیا، حامیان امن کی کوشش دنیا کے سارے اقوام کی فوجی طاقت کو گھٹا کر آیندہ جنگ کو ناممکن بنانے اور دنیا میں امن و امان قائم کرنیکی رہی، مگر اس میں انہیں آج تک کامیابی نہیں ہوئی، بلکہ امن کے اس اٹھارہ سال کے درمیان میں جملہ اقوام نے اپنی اپنی فوجی طاقت کو بڑھایا اور سائنس کے جدید تجربوں سے استفادہ کر کے بنی نوع انسان کو سابق کے مقابلہ میں ہلاک کرنیکے زیادہ طریقے معلوم کیے گئے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنگ عظیم ہونے کی صورت میں بنی نوع انسان کو تباہ کرنے کا جو مواد موجود ہے، وہ (۱۸) سال قبل کی جنگ عظیم کے وقت نہ تھا۔ لہذا ظاہر ہے کہ موجودہ صورت حال کس قدر مہیب ہے۔"

(رعیت ہفتہ وار مورخہ ۱۹ اپریل ۱۹۳۶ء)

(۱۵) کرشنا سوامی مدیراج

کرشنا سوامی مدیراج حیدرآباد کے متوطن اور مدیراج قوم سے تعلق رکھتے ہیں اردو اور انگریزی میں بڑی اچھی قابلیت ہے، آپ کی مشہور انگریزی کتاب "حیدرآباد پکٹوریل" ہے جس کے کئی جلدیں شائع ہوئی ہیں، آپ مجلس بلدیہ کے نائب میئر اور میئر رہ چکے ہیں، اردو کتابوں کے بھی مصنف ہیں، مدیراج قوم کی ترقی کے لئے آپ نے بڑی جدوجہد کی ہے، تاریخ سے خاص دلچسپی ہے، عبارت کا نمونہ پیش ہے:

"قلعہ گولکنڈہ کو اولاً راجہ کرشن داس نے معمولی حیثیت میں تعمیر کیا تھا۔ اسکی فصیل اینٹ اور مٹی سے تعمیر ہوئی تھی، کہا یہ جاتا ہے کہ اس قلعہ کو ۱۳۶۳ء میں راجہ صاحب ورنگل نے محمد شاہ بہمنی کو بعض سیاسی مصالحت اور چند شرائط اور معاہدات کے تحت حوالے کیا تھا، اسوقت سے یہ قلعہ مسلم بادشاہوں کے قبضہ و تصرف میں رہا، جب تلنگانہ میں قطب شاہی سلطنت قائم ہوئی تو سلطان قلی قطب شاہ نے اسکو اپنا دارالخلافہ قرار دیا اور اپنا مستقر بھی اسکو بنایا، اسکے بعد ابراہیم قلی قطب شاہ تخت نشین ہوا تو اس نے قلعہ کو غیر موزوں اور غیر محفوظ سمجھکر اسکی فصیل کو منہدم کرا کر شہر کی مضبوط نئی فصیل تعمیر کیا۔ اس قلعہ کا طول آٹھ ہزار گز ہے اس میں آٹھ دروازے اور چار سو برج تعمیر کئے گئے[۱]۔"

---

(۱) گولکنڈہ اور شہر حیدرآباد (اخبار نیا ہندوستان) یکم نومبر ۱۹۶۵ء

(۱۶) جگناتھ پرشاد صاحب حیدرآباد وطن، حکمت پیشہ کرتے تھے، وکالت میں بھی کامیابی حاصل کی، بذلہ سنج اور خوش طبع ادیب ہیں، ۱۹۳۱ء میں ایک ہفتہ وار اخبار "دکن پنچ" کے نام سے شائع کیا تھا، عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"ہندوؤں میں اکٹروں کا درجہ اسوقت بہت اونچا سمجھا جاتا تھا اور ایکٹ بھی نہایت مہذب طریقہ پر کیا جاتا تھا، ناٹک کے مصنفین تو نہایت ہی بلند پایہ اور بلند خیال ہوا کرتے تھے، حتیٰ کہ بعض اوقات بادشاہ خود ڈرامے لکھتے تھے، چنانچہ مٹی کے گاڑی کا جو سنسکرت ڈراموں میں ایک بہترین ڈرامہ ہے اسکا مصنف شودرگ مگدھ کا بادشاہ ہے، یوں تو ہندو ناٹکوں کی تعداد اسقدر زیادہ ہے کہ انکی فہرست بھی مرتب کرنا مشکل ہے۔ ہم صرف بعض مشہور و معروف ناٹکوں پر اکتفا کرتے ہیں۔"[۱]

(۱۷) ست گرو پرشاد صاحب حیدرآباد کے ایک مشہور کایستھ خاندان کے فرد ہیں حضرت باقی جن کا تذکرہ صفحات ماقبل میں ہو چکا ہے، آپ کے نانا تھے، ست گرو پرشاد صاحب کی ابتدائی تعلیم مدرسہ مفید الانام میں ہوئی پھر نظام کالج سے کامیابی حاصل کی پھر وکالت کا امتحان بدرجہ اعلیٰ پاس کر کے وکالت شروع کی اور ایڈوکیٹ کا اعزاز پایا۔

---

[۱] دکن پنچ مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۳۱ء۔

آپ کو اپنے قانونی پیشہ کے ساتھ ساتھ ادب اور تاریخ سے بڑی دلچسپی ہے، مطالعہ کا بڑا شوق ہے، ایک بہت اچھی اور شاندار لائبریری جمع کرلی ہے، تصنیف تالیف سے شغف ہے "تحفہ" "یادرفتگاں" قواعد بہی کھاتہ وغیرہ شائع کرچکے ہیں، آپ نے تاریخ دکن پر ایک مبسوط اور جامع کتاب قلمبند کی ہے جو فلسکیپ سائز کے کئی ہزار صفحات پر حاوی ہے مگر یہ مسودہ کی صورت میں ہے ہنوز شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی ۔ اگر یہ شائع ہوجائے، تو اردو ادب میں بیش قیمت اضافہ ہوگا، کیونکہ آپ نے اسکو نہایت کدوکاوش اور جانفشانی تلاش و تحقیق کے بعد لکھا ہے ۔

(۱۸) ڈاکٹر ایشورناتھ ٹوپا

آپ کا وطن یوپی ہے مگر عرصہ دراز سے ملازمت کے سلسلہ میں حیدرآباد میں اقامت کرلی ہے، جرمنی کی ڈگری ڈی فل (فرئبرگ) یونیورسٹی سے حاصل کرلی ہے اولاً جامعہ عثمانیہ میں تاریخ کے ریڈر تھے پھر محبوب کالج کے پرنسپل رہے اب دارالترجمہ کے ناظم ہیں اور کلیہ جامعہ عثمانیہ کے رجسٹرار ہیں ۔

انگریزی میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں، اردو میں بھی کئی ایک کتابیں قلمبند کی ہیں، ان میں سے ایک ادارہ ادبیات اردو نے ہندوستانی تمدن جلد اول کے نام سے شائع کیا ہے ۔

یہ کتاب اسلئے خصوصیت سے اہمیت رکھتی ہے کہ اردو میں کوئی مکمل تاریخ ہندوستان کے تمدنی کارناموں کی نہیں ہے ۔ ٹوپا صاحب نے تین جلدوں میں اس کتاب کو قلمبند کرنے کا ارادہ کیا ہے ۔ ان میں سے ایک جلد شائع ہوگئی ہے باقی دو جلدیں تیار ہیں مگر ہنوز شائع نہیں ہوئیں ۔

ٹوپا صاحب نے اسکے علاوہ بھی اردو میں کئی کتابیں لکھی ہیں اور مضامین

بھی قلمبند کیئے ہیں، جو دنیائے اردو میں اپنے خصوصی معلومات کے باعث قابل قدر قرار پاتے ہیں۔ تمدن ہندوستان کی پہلی جلد حسب ذیل دس باب میں منقسم ہے (۱) قدیم ترین تمدن (۲) آریا اور انکا تمدن (۳) پروہت کا تمدن (۴) روحانیت کا فلسفہ (۵) سماجی نظام کا آغاز (۶) انسان کی تہذیب (۷) سیاست اور تمدن (۸) بدھی فن کاریت (۹) دنیا دار، عقیدت مند انسان اور اسکا زمانہ (۱۰) تمدن کا احیاء۔

اس صراحت سے واضح ہو سکتا ہے کہ جلد اول کسقدر اہم عنوانات پر مشتمل ہے۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

"بدھ مت کا جنم۔ اسی بے چینی کی فضا نے بدھ مت کو جنم دیا تھا، گوتم بدھ کے سامنے سب سے بڑا سوال مسئلہ زندگی کی اہمیت کا تھا، زندگی کی قدروں کو پہچاننا اور اس کی قوتوں سے آگاہ ہونا تاکہ ہر انسان اپنی زندگی کا حل خود ڈھونڈھ سکے۔ بدھی نصب العین ہے۔ اپنشد کی تحریک کی جھلک جین مت اور بدھ مت دونوں میں نمایاں نظر آتی ہے جین مت کے اصول۔ جین بدھ مت سے پرانا تھا، اسکے بنیادی اصول کے تحت جیو کو نیک کرموں (افعال) کے ذریعہ آزاد کیا جا سکتا ہے۔ یہ مذہب ایک طرف تو انسان کو آزاد کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ دوبارہ جنم نہ لے سکے (جینیوں اور بدھوں نے زندگی کی غلامی یا قید انسان کے جنم میں دیکھی تھی) لیکن دوسری طرف انھوں نے انسان میں وہ قوت بھی دکھائی جس کے ذریعہ روحانی مسلک حاصل کیا جا سکتا ہے۔" ہندستانی تمدن صفحہ ۱۱۳ و ۱۱۴۔

(۱۹) رائے جانکی پرشاد

حیدرآباد آپ کا وطن ہے یہاں ہی سنہ ۱۹۰۱ء میں ولادت ہوئی، ابتدائی تعلیم چادر گھاٹ ہائی اسکول میں ہوئی، پھر نظام کالج میں تعلیم پانے کے بعد سرکاری ملازمت میں شامل ہوئے، اٹھارہ سال تک سررشتہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ میں ملازمت کرنے کے بعد آپ کا تبادلہ محکمہ اطلاعات میں سنہ ۱۹۳۹ء میں عمل میں آیا۔ اکٹوبر سنہ ۱۹۴۳ء سے آپ نائب ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ رہے اور گزشتہ سال پچپن سالہ عمر کے لحاظ سے وظیفہ حاصل کیا۔ اب سوشل خدمات مصروف ہیں۔

جانکی پرشاد صاحب مشرقی تمدن اور تہذیب، مشرقی روایات کے گرویدہ ہیں، ہندو مسلم اتحاد اور امن و شانتی کا پرچار کرتے رہے اور اسی کے حامی اور موئید ہیں، عرصہ دراز تک انجمن قیام امن کے پبلسٹی افیسر رہے، اس انجمن نے اپنے دور حیات میں بڑے قابل قدر خدمات انجام دئے ہیں، جس کا سہرا جانکی پرشاد صاحب کے سر ہے۔

زمانہ تعلیم ہی سے آپ کو مضمون نویسی تصنیف و تالیف کا شوق رہا۔ تاریخی، اصلاحی، سماجی، تعلیمی مضامین سے زیادہ شغف رہا۔ نشرگاہ حیدرآباد سے اکثر آپ کی تقریریں نشر ہوتی ہیں، جو معلومات آفریں اور دلچسپ ہوتی ہیں۔

انھوں نے پولیس ایکشن کے بعد نائب ناظم اطلاعات کے حیثیت سے جو کارنمایاں انجام دئے ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں جس سے انکار کرنا حقیقت کا بطلان ہے۔

"عصر جدید" کے نام سے آپ کی ایک کتاب شائع ہو چکی ہے جو حضور نظام آصفجاہ سابع کے چہل سالہ جوبلی کے موقع پر شائع ہوئی تھی، اس کتاب میں چالیس عنوان کے تحت دور عثمانی کے نظم و نسق کی ترقی کا ذکر کیا گیا ہے، اور اہم اصلاحات

اور قابل قدر ترقیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔
جانکی پرشاد صاحب کا اسلوب بیان صاف اور سادہ عام فہم ہوتا ہے
ساتھ ساتھ دلچسپ بھی۔
آپ کی نثر کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"انسانی ترقیوں کی تاریخ دراصل اسکے تدریجی تسلط وکارفرمائی کی داستان ہے۔ اور ذرا سے غور کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کا یہ سب سے کمزور جاندار کس طرح زمین کی وسعتوں اور آسمان کی بلندیوں پر قابو پا گیا۔ اسکا جسمانی ضعیف اسکی ذہنی دوڑ اور ان تھک جستجو کی سدراہ نہ ہو سکا۔ انسانی ترقیوں کی یہ رفتار باعتبار نوعیت ہر زمانہ میں جدا جدا رہی ہے۔ ابتداً ایشیائی قوموں کی ترقیاں کچھ اور بنیادیں اور نوعتیں رکھتی تھیں لیکن اب یورپی قوموں کی ترقیاں مشاہدات تجربات کی بنیادوں پر قائم کی گئی ہیں جو علمی اعتبار سے اور ادبی و طبعیاتی اور سیاسی و تاریخی اعتبار سے قومی وملکی ترقی کا دراصل پیش خیمہ ہے۔

یورپی ترقی کے بظاہر دو اہم نقاط نظر ہیں جنکے آگے دنیا کی ساری قومیں اس مادی رنگ میں رنگی جا رہی ہیں۔

....

ابتک ہندوستان کے سیاسی اہل نظر نے قومی اور مذہبی یگانگی کے دور کرنے کی ہزارہا کوششیں کیں اور ایک ہندوستانی قومیت کا نظریہ پیش کیا۔ اس مبحث پر ہندوستان کے نامور

لوگوں نے دھواں دھار تقریریں کیں اور بڑے بڑے نادر مضامین لکھے مگر وہ نظریہ آجتک عمل میں نہ آسکا ہمارے اعلیٰحضرت بندگانعالی نے نظامِ تعلیم ہی ایسی وسیع النظری سے منظور فرمایا کہ ایک ملکی قومیت خود بخود متشکل ہوگئی۔ اور امید ہے کہ آئندہ یہ مبارک نظریہ ہمارے ملک کی مذہبی بیگانگی کو بالکل مٹادیگا۔ اور عاقبت اندیش نوجوانان ملک اس نوزائیدہ ملکی قومیت کو رواداری کے زیر سایہ رکھیں گے"

عصر جدید صفحہ ۲۹ و ۳۰ ۔

(۲۰) پنڈت نریندر جی

پنڈت جی کا خاندان حیدرآباد سے تعلق رکھتا ہے۔ اپریل ۱۹۰۷ء میں ولادت ہوئی کم عمری سے مطالعہ کا شوق دامنگیر رہا، پھر فقیروں اور سادھوں کی صحبت میں زندگی بسر کرنے لگے، اور پھر رشی دیانند جی کو گرو مان کر انکی پیروی شروع کی اور لاہور جاکر آریہ سماج کی درسگاہ میں تعلیم حاصل کی بعد واپسی آریہ سماج کی تحریک کا پرچار کرنے لگے، حکومت نے گرفتار کرکے منانور روانہ کیا مگر اسکے بعد جب وہاں سے واپس آگئے تو پھر اسی تحریک کے سرگرم معاون ہوگئے، کئی مرتبہ زبان بندی ہوئی مگر نریندر جی ہمیشہ اپنی تحریک کو سرگرمی سے آگے بڑھاتے رہے آریہ سماجی کی تحریک کے ساتھ آپ کانگریس کے بھی حامیوں میں شامل ہیں پنڈت جی ایک اچھے مقرر بھی ہیں اور انشاپرداز و افسانہ نگار بھی تاریخ سے بھی دلچسپی ہے آپ کی دو اردو کتابیں شائع ہوئی ہیں "ایک دیانند جی کی سوانح عمری" ہے اور دوسری "حیدرآبادی ہندو مسلم تعلقات"۔ تقریریں تو اکثر و بیشتر اردو میں کرتے ہیں، آپ کے افسانہ کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

"قیدی انتہائی اضطراب کے عالم میں اپنے کمرے کے اندر ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر چکر کاٹ رہا تھا، اس نے اچانک دروازہ کے پاس آکر آواز دی۔

"بھائی سردار"

سردار نے آنکھیں ملتے ہوئے بلند آواز سے کہا

ہوشیار رہو،

قیدی نے تھوڑی دیر بعد پھر کہا

بھائی سردار

آواز کو پہچان کر سردار قیدی کے پاس گیا اور پوچھا

کیا کہتے ہو،

تم نے مجھے ایک دن چھوڑ دینے کا خیال ظاہر کیا تھا؟

یاد ہے نا

کب

تھوڑے ہی دن کی بات تو ہے

بھائی میں کس قابل ہوں جو کسی کے کام آسکوں

پھر بھی یاد کرو تم نے مجھ سے پوچھا تھا۔ رہائی چاہتے ہو؟

میں نے کیا جواب دیا تھا یاد ہے،

ہاں تم نے کہا تھا رہائی قبول نہیں مگر —— مگر اب قبول ہے

اب میں سلاخوں کی اس دنیا سے جلد از جلد آزاد ہونا چاہتا ہوں بولو میرے بھائی بولو میری مدد کرو گے،

ضرور کرونگا اپنی جان دیکر وعدہ پورا کرنا سردار جانتا ہے۔"[1]

تاریخی کتاب کا نمونہ :-

"حیدرآباد میں محرم ہندو اور مسلمان مشترکہ طور پر مناتے تھے علموں کے ساتھ ہزاروں ہندوؤں اور مسلمانوں کا اژدحام ہوتا ایک دوسرے کے مذہبی اور سماجی تقریبات اور تہواروں میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے شرکت کرکے اپنا مذہب اور دھرم نہیں کھویا تھا، بلکہ اسے مضبوط اور پختہ بنانے کے علاوہ وہ قیمتی متاع حاصل کرلی تھی، جو اب ان کے ہاتھ سے چھٹی جارہی ہے، اور جسے عرف عام میں محبت اور اخوت اور اتحاد و رواداری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

مذہبی شدت و کٹر پسندی کے باوجود ہمارے ہندو مسلم اسلاف کے اذہان و افکار کندن کی طرح چمکدار تھے، ہندو مسلم کی تفریق انکے مشرب میں ایک گناہ تھی۔"[2]

(۲۱) پی ہنمنت راؤ پی ہنمنت راؤ صاحب کا وطن محبوب نگر ہے، آپ ان لوگوں میں شامل ہیں جو خلوص دل کے ساتھ قومی اور ملکی کام انجام دیتے ہیں، حکومت حیدرآباد میں نائب وزیر کی خدمت پر مامور کیئے گئے تھے۔

آپ نے اپنی بے لوث کوشش سے پچاس ہزار ایکڑ سے زیادہ زمینات نادار کسانوں میں تقسیم کرنے کیلئے حاصل کرلیں، صرف ایک ضلع سے اسقدر زیادہ

---

[1] ایوان سالنامہ ۱۹۵۱ء صفحہ ۲۷۹ افسانہ قیدی [2] حیدرآباد میں ہندو مسلم تعلقات۔

زمینات کسی اور مقام سے حاصل نہیں ہوئی یہ صرف پی ہیمنت راؤ صاحب کی کوشش و جدوجہد کا نتیجہ ہے۔

اردو سے آپ کو خاص دلچسپی ہے، ادارہ ادبیات اردو کی انتظامی مجلس کے آپ رکن ہیں اور ادارہ کے کاموں سے اس کے آغاز سے پوری دلچسپی لیتے ہیں، کئی ادبی اور علمی جلسوں کی صدارت فرمائی ہے اور دلچسپ و معلومات آفریں خطبے پڑھے ہیں۔

عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ عصمت مرحوم کے مزاحیہ کلام کے بعد ایک اور تصنیف جو غالب دہلوی کے مشہور و معروف شاگرد حکیم معشوق علی خاں جوہر سے متعلق ہے، جسے صحیح معنوں میں مذاحیہ سوانح کا شہ کار کہنا چاہیے زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آگئی ہے۔

جوہر مرحوم سے عصمت اللہ بیگ نے ادبی فیضان حاصل کیا تھا یہ مقالہ حکیم جوہر کی زندگی اور سیرت کا ایک ظریفانہ اور دلکش عکس ہے۔ مرزا عصمت اللہ بیگ مرحوم کے اس شہکار اور دلچسپ مقالہ سے متاثر ہو کر ملک کے ممتاز ادیب مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم نے اپنے استاد "نذیر احمد کی کہانی کچھ انکی اور کچھ میری زبانی" اپنے انداز میں لکھی تھی۔"

لے جوہر از عصمت اللہ بیگ مرحوم۔

(۲۲) سیتو مادہوراؤ

سیتو مادہوراؤ صاحب پگڑی گلبرگہ یعنی کرناٹک کے متوطن ہیں، انکا خاندان دو صدی سے حکومت آصفیہ میں مالگذاری کے خدمات انجام دیتا رہا انکے والد تحصیلداری کرتے رہے، مادہوراؤ صاحب کی تعلیم گلبرگہ کے بعد بنارس اور پھر الہ آباد میں ہوئی بنارس سے بی اے اور الہ آباد سے تاریخ میں یم اے کی ڈگریاں لیں تحصیلداری سے ملازمت کا آغاز ہوا، پھر دوم تعلقدار رہے پولیس ایکشن کے وقت مددگار ناظم بندوبست تھے اسکے بعد اول تعلقدار، معتمد مجلس مال، ناظم تعلیمات ہوم سکریٹری اور پھر معتمد تعلیمات کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے اب صوبہ بمبئی میں منتقل کئے گئے ہیں، آپ تیرہ چودہ زبانوں کے ماہر ہیں انگریزی، اردو، ہندی، مرہٹی، تلنگی، کنڑی، اور فارسی، بنگالی، گجراتی کے علاوہ گونڈ بھیل وغیرہ کی زبانوں سے واقف ہیں، انگریزی، مرہٹی، کنڑی، تلنگی زبانوں میں کئی کتابیں تصنیف کی ہیں تاریخ آزادی ہند کے سلسلہ میں حیدرآباد اسٹیٹ کمیٹی کے کنوینر رہے اور تین جلدیں مرتب کردیں جو شائع ہوچکی ہیں۔

سیتو مادہوراؤ صاحب اردو سے بخوبی واقف ہیں علمی جلسوں میں طویل تقریریں اردو میں فرمائی ہیں چنانچہ ادارہ ادبیات اردو کے جشن جوبلی میں مرہٹی ادب؟ اردو میں طویل دلچسپ اور معلومات آفریں تقریر فرمائی اسطرح انجمن ترقی اردو کے زیراہتمام جنگ آزادی میں حیدرآباد کا حصہ کے عنوان پر ڈیڑھ گھنٹہ تک تقریر کرتے رہے اور لوگوں کو اسکے دوسرے حصے کا اشتیاق رہا مگر افسوس اسکا موقع نہیں ملا۔ اسکے علاوہ دوسری کئی انجمنوں، کالجوں میں آپکی تقریریں ہمیشہ معلومات آفریں اور دلچسپ ثابت ہوئیں۔ جن زبانوں میں تقریر کرتے ہیں وہ اپنی روانی تسلسل اور خیالات کی گہرائی کے لحاظ سے قابل قدر

ہوتی ہے۔ نمونہ عبارت:

چندو لال کے زمانہ میں نظم و نسق کا نام و نشان نہیں تھا، یہ بالکل صحیح اور امر واقعہ ہے، چندو لال میں ایک بھی خوبی تھی اور وہ یہ کہ وہ انگریزوں کے اشارے پر چلتا تھا، انگریزوں نے کہا کہ قرض لو تو چندو لال نے کہا بہت خوب ہم قرض لئے لیتے ہیں، انگریزوں نے کہا ہم قرض کی رقم پر اتنا سود لیتے ہیں۔ چندو لال نے کہا بہت بجا لائیے میں ابھی تمسک پر دستخط کئے دیتا ہوں! انھوں نے کہا ہم اپنی فوج یہاں رکھتے ہیں۔ چندو لال نے کہا بہت اچھی بات ہے! انھوں نے کہا انگریزی فوج کی تربیت کیلئے انگریزی افیسر رکھتے ہیں تو چندو لال نے کہا منظور، انگریزوں کی تنخواہ بڑھانے کیلئے کہا گیا تو چندو لال نے کہا برابر بڑھائیے! انھوں نے کہا انگریز عہدہ داروں کو تعینات کیا جاتا ہے کیا جاتا ہے تو چندو لال کہتے ہیں اس کے لئے تو ہم بہت بے چین ہیں۔ یہ تھا چندو لال کا دور"۔

(۲۳) جی شنکر راؤ جی شنکر راؤ صاحب ایک کہنہ مشق افسانہ نویس ہیں، طبعزاد اور ترجمہ دونوں قسم کے افسانہ آپ کے نقش قلم کے یادگار ہیں افسانے اصلاحی اور سبق آموز ہوتے ہیں اردو کے معیاری رسالوں میں یہ افسانے شائع ہوکر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں، اگرچہ آپ کے افسانوں کا کوئی مجموعہ ابتک شائع نہیں ہوا ہے مگر انکی خاصی تعداد ہوگئی ہے۔ افسانوں کا پلاٹ، کردار نویسی دونوں حیثیت سے شنکر راؤ صاحب کے افسانے پسند کئے جاسکتے ہیں۔

(۲۴) کرشن چندر رائے سکسینہ مشہور کائستھ خاندان کے سپوت ہیں الہ آباد یونیورسٹی سے تاریخ میں یم اے کی ڈگری لی ہے، لکھنؤ کی کئی کالجوں میں تاریخ کے لکچرار اور پروفیسر رہے اس کے

بعد جامعہ عثمانیہ کے شعبہ تاریخ میں لئے گئے، تصنیف و تالیف کا شوق رہا، تر کے میدان میں اپنے نقش ثبت کئے۔ "سیاسی نصب العین" آپکی مشہور کتاب ہے۔

عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"عہد ماضی زمانہ حال سے اسقدر پیوست ہے کہ عہد[1] ملک کے سیاسی حالات کا صحیح اندازہ کرنیکے لئے متواتر ان واقعات کو پیش نظر رکھنا لازمی ہے جنکا نقش آب ہستی پر باقی نہیں رہا۔ عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو باتیں ہم عموماً کرتے ہیں ان کے کرنیکے واسطے ہم کس طرح آمادہ ہو گئے۔ محض اس امر کی تشریح کا نام "تاریخ" ہے جو کچھ ابتک وقوع پذیر ہو چکا ہے اس میں ہم کو صرف اسلئے دلچسپی حاصل ہو سکتی ہے کہ ہم ان واقعات کا مدعا و مقصد سمجھنا چاہتے ہیں، جو دورِ موجودہ میں پیش آ رہے ہیں۔"

(۲۵) لاہوتی | سری نواس صاحب لاہوتی جامعہ الہ آباد سے استفادہ کیا اور اردو ادب سے بڑی دلچسپی ہے۔ قاضی عبدالغفار صاحب کے ساتھ ایک عرصہ دراز تک اخبار پیام کے اسٹاف میں کام کرتے رہے اسکے بعد جب اختر حسین صاحب پیام کے اڈیٹر ہوئے تو لاہوتی صاحب نے جائنٹ اڈیٹر کی حیثیت سے عرصہ دراز تک انکا ہاتھ بٹایا۔ ۱۹۲۱ء میں تولد ہوئے، اولاً عربی، فارسی کی تعلیم پائی اسکول میں فانی بدایونی سے استفادہ کیا کئی مرتبہ سیاسی تحریکات کے ضمن میں جیل کی سیر کی ہے، ترقی پسند مصنفین کے زمرہ میں شامل ہیں، اردو اور ہندی دونوں زبانوں سے شغف ہے اور دونوں میں اپنے مضامین اور افسانے لکھا کرتے ہیں، سیاست اور

[1] سیاسی نصب العین۔

ادب میں انھوں نے اپنی جگہ قائم کرلی ہے اور اچھی شہرت رکھتے ہیں۔

"فرانسیسی اکیڈیمی کے علماء نے اندازہ لگایا ہے کہ اسوقت دنیا میں (۲۷۹۶) زبانیں بولی جاتی ہیں، دوسری جنگ عظیم میں امریکہ کی شرکت کے بعد وہاں کے محکمۂ اطلاعات جنگ نے مندرجہ ذیل اعداد شمار شائع کئے تھے، ان اعداد شمار سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کی اہم ترین زبانیں کونسی ہیں، اور انکے بولنے والوں کی تعداد کیا ہے؟

انگریزی زبان (۲۶) کروڑ، ہندوستانی (۱۶) کروڑ، روسی (۱۵) کروڑ، اسپینی (۱۱½ کروڑ)، جرمن (۹) کروڑ (۸۰) لاکھ، جاپانی (۷) کروڑ (۷۰) لاکھ فرانسیسی (۷) کروڑ، بنگالی (۶) کروڑ (۲۰) لاکھ اطالوی (۵) کروڑ (۲۰) لاکھ اور پرتگالی (۵) کروڑ۔

تقریباً (۴۰) کروڑ انسان ایسے ہیں جو چین کی خاص خاص تو بولیاں بولتے ہیں۔ چینی بولیوں میں بعض ایسی ہیں جن میں اتنی مشابہت بھی نہیں پائی جاتی جتنی ولندیزی اور انگریزی زبان میں ہے۔ چین میں اسوقت سب سے زیادہ "منداری" زبان بولی جاتی ہے اور یہی وہاں کی سرکاری زبان ہے .... ہندوستان کی بڑی عجیب حالت ہے، ہندوستانی صرف پچاس فیصد لوگوں کی مادری زبان ہے جو اسے بول سکتے ہیں، اب ہندوستانی کا استعمال اور ارتقاد ذرائع آمد و رفت کی بڑھتی ہوئی ترقیوں کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ چالیس کروڑ باشندوں کی اس زمین میں تقریباً

چالیس بڑی بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں۔" [1]

(۲۶) کاشی ناتھ راؤ کلپارکر آپ نظام آباد کے ایک خوشحال گھرانہ سے تعلق رکھتے ہیں وکالت آپکا پیشہ ہے، اردو سے دلچسپی ہے "وطنداروں" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے، اس میں وطنداران تلنگانہ کے متعلق تفصیلی صراحت کی گئی ہے، عبارت کا نمونہ یہ ہے:-

"وطنداران (پٹیل پٹواری) ملک سرکارعالی کی (جو عہدہ داران دہی کے نام سے بھی ملقب ہیں) ریاست ابد مدت میں بہت بڑی اہمیت ہے اس مملکت وریاست کی شاندار عمارت خود ان ہی کی بنیاد پر کھڑی ہے۔ تاریخ اسکی شاہد ہے کہ حالیہ وطنداروں کے بزرگوں نے اس ریاست کے بنانے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے، اور انکے کارنامے نہایت درخشاں وتاباں ثابت ہوئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بادشاہان وقت نے انکی محنت ومشقت نمک خواری اور نمک حلالی کی قدر کر کے انہیں بہت بڑی خدمات جائداد از قسم اراضیات وغیرہ بطور انعام کے دئے ہیں۔" [2]

(۲۷) ایل پی بھٹناکر بھٹناکر صاحب حیدر آباد کے مشہور اہل قلم ہیں اخبارات میں آپ کے مضامین شائع ہوتے ہیں عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"آج ہندوستان آزادی کی آٹھ منزلیں طے کرنیکے بعد ایک

---

[1] رسالہ نگار جنوری ۱۹۵۷ء۔ [2] وطندار مطبوعہ۔

جدید منظم اور طاقتور اکائی میں تبدیل ہو رہا ہے۔ اور تاریخ ایک نئے باب کا اضافہ کر رہی ہے، سردار پٹیل نے ریاستوں کی تنظیم کا کام جس شاندار کامیابی سے شروع کیا تھا اسکی تکمیل آج ہو رہی ہے۔ گویا ہندوستان جو انگریزی دور میں (۵۵۰) ریاستوں میں منقسم منتشر اور غیر منظم حالت میں تھا آج وہ منظم اور طاقتور ریاستوں پر مشتمل وحدت میں تبدیل ہو رہا ہے۔" اخبار رہنما یکم نومبر ۱۹۵۶ء۔

(۲۸) کشن سنگھ

خوشتر تخلص کا تذکرہ شعراء کے ذیل میں ہو چکا ہے۔ آپ کو نثر نگاری میں بھی اچھی مہارت ہے، افسانہ نگاری کا شوق ہے۔ مزاحیہ نگاری کی بھی مشق ہے "ننھے مرزا" کے عنوان سے آپ کا ایک طویل افسانہ دکن پنچ میں شائع ہوا ہے۔ عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

"ننھے میاں اسم بامسمیٰ تھے، جوانوں میں انکی طبیعت لگتی نہ تھی اور بوڑھوں سے تو انہیں سخت نفرت ہی تھی۔ انکا مشغلہ نوجوان لڑکوں سے ہمیشہ مباحثہ چھیڑ چھاڑ ہنسی دل لگی تھا اکثر آپ محلے کے لڑکوں ہی میں نظر آتے تھے۔ آپ بڑے سادہ مزاج، سادہ لوح، غرور اور تمکنت کا تو نام نہیں ظریف الطبع ایسے کہ روتے کو ہنسانا انکے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ آپ کی زوجہ محترمہ کا انتقال ہونے پر آپ نے حال ہی میں ایک مقبول صورت نوجوان بیوہ کو نکاح میں لائے ہیں، لیکن انکی محترم بیوی صاحبہ اکثر خفا رہا کرتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ ننھے میاں کی طبیعت میں ابھی بچپن کی شوخیاں، شرارت

جھلملا رہی ہے۔"

(۲۹) اندر سین صاحب ماتھور

ماتھور صاحب بھی اس دور کے صاحب قلم ہیں، آپ کی ایک کتاب جس کا نام "حیدرآباد میں ہندو، انکا پوزیشن تعلیمی حالت اور اقتصادی کیفیت پر تبصرہ" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں آپ نے بڑی تحقیق سے ہر پہلو اوجاگر کیا ہے، اور دیانتداری سے تحقیق کی داد دی ہے۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے:

"متذکرہ صدر واقعات سے آپ کو پتہ چل گیا ہوگا کہ حکومت سرکار عالی نے ابتک ہر معاملہ میں ہندو مسلمانوں کو برابر سمجھا ہے بلکہ اکثر مواقع پر ہندوؤں کو ترجیح دی ہے، رعایا حیدرآباد میں اسی طرح اپنے آقا کے ساتھ وفاداری اور ایمانداری سے رہے ہیں دو سو برس آصفی خاندان کو ہوتے آئے ہیں، کبھی کسی کو اس کی قسم کی شکایت کا موقع نہیں ملا۔ ایشور ہمارے تعلقات ہمیشہ اسی طرح قائم رکھے۔"

(۳۰) پورن چند شاکر

شمالی ہندو وطن اسوقت حیدرآباد میں اخبار ملاپ کے ایڈیٹر ہیں شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی، ملنسار، با اخلاق، ذہین شخص ہیں، تھوڑے ہی عرصہ میں حیدرآباد کے علمی حلقہ میں اپنا مقام بنالیا ہے، اردو ادب سے بڑی دلچسپی ہے اور اور اس کے ساتھ وہ دوسرے ادیبوں کو انکے جائز مقام دینے سے کبھی پس و پیش نہیں کرتے سچے علمی خدمتگزار اور ادب کے پرستار ہیں شاکر صاحب کیوجہ

لہ دکن پنچ سالنامہ ۱۳۲۹ف۔ ۲ حیدرآباد میں ہندو۔

سے اخبار ملاپ نے بڑی ترقی کی ہے عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

"آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

ہر نئی صبح رات کے کھنڈرات پر اپنا نورانی محل تعمیر کرتی ہے، صبح کا وزن کبھی آہ نیم شبی اور کبھی سرود جنگ کی دلنواز تانوں کی صدائے بازگشت کو نوید صبح کا روپ دیتا ہے، صبح کا ستارہ رات کے سرمائے کو جو کسی مجبور کی آہوں اور کسی خوش نصیب رنگین گھڑیوں کی یادوں کا مجموعہ ہوتا ہے، سورج کی پہلی کرن کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس طرح سورج کی درخشاں کرنوں سے نیا دن کا عمل کچھ دیر بعد آمد شب کے تصور سے دھندلا ہونے لگتا ہے سورج کا چہرہ ایک بار غصہ سے سرخ ہو جاتا مگر شام کے سائے آگے بڑھ کر اسے دبوچ لیتے ہیں، پھر رات کی رانی اپنی سیاہ زلفیں پھیلائے نمودار ہوتی ہے یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، دن کے بعد رات رات کے بعد دن ماضی کا حصہ بنتے چلے جاتے ہیں، زندگی کا شاہسوار وقت کے راہی اور تیز رفتار سوار آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، نہ کبھی پیچھے مڑتا ہے اور نہ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے۔"[1]

(۳۱) منوہر پرشاد ماتھر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، نظام کالج میں زیر تعلیم ہیں اردو ادب سے خاص دلچسپی ہے، تنقیدی شعبہ سے ذوق ہے۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

---

[1] اخبار ملاپ یکم نومبر ۱۹۵۶ء۔

"فانی کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں آلام و مصائب اور ناکامی اور نامرادی کی ایک تاریخ ملے گی، وہ ساعتیں جنہیں آسایش کہا جا سکے انہیں با شعور ہونے سے پہلے ہی میسر آتی ہوں اس کے بعد تو ایسا ہوا نہیں، اسکی وجہ سے ان کا احساس لاشعوری طور پر قوی ہوتا گیا اور شعوری طور پر بھی وجہ جبر مسلسل کے قائل ہو گئے۔

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں   ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

اور یہ جبر کا نظریہ صرف عقیدے کے طور پر نہیں تھا، جس سے ذمہ داری کی سبکدوشی کی کوششیں کی جاتی ہیں اور اپنے قوائے عمل کے ناکارہ ہونے پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔" (نظام ادب شمارہ ۲۸ نمبر ۱ و ۲)۔

(۳۲) این، جی، راجور کر

نظام کالج کے طالب علم یم اے کی ڈگری حاصل کی، اردو سے پوری دلچسپی ہے، ادب کا اچھا ذوق رکھتے ہیں، نمونہ عبارت پیش ہے۔

"دنوں کے پہلے کی بات ہے، سہانی شام تھی، باغ میں چمن پر لیٹے ہیں شعر و سخن کا مزہ لے رہا تھا، میرے دوست سعید کی غزل سنا رہے تھے مطلع تھا۔

آئیں کیوں ہچکیاں نہیں معلوم   کون ہے مہرباں نہیں معلوم

مطلع کہتے ہوئے دوست مسکرائے، میں بھی مسکرایا اونہوں نے دوسرا شعر پڑھنا شروع کیا۔

یاد آتا ہے کہ برق چمکی تھی   کیا ہوا آشیاں نہیں معلوم

مَیں نے خوشی سے سر ہلایا اور شعر کی داد دی ...."

(نظام ادب)

فرزندان جامعہ عثمانیہ

صفحات گزشتہ میں ان نثر نگاروں کا تذکرہ کیا گیا ہے جنکو جامعہ عثمانیہ سے تعلق نہیں تھا۔ اب ہم ان اصحاب کا تذکرہ کرتے ہیں جنہوں نے جامعہ عثمانیہ سے استفادہ کیا ہے، یوں تو جامعہ عثمانیہ میں سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ہندو طلبہ نے تعلیم پائی ہے، مگر خصوصیت سے جو فرزندان جامعہ عثمانیہ اردو ادب سے دلچسپی لیتے رہے ہیں انکا تعارف کرایا جاتا ہے۔ مگر اس امر کا خیال رہے کہ جامعہ کے فارغ التحصیل تمام ادیبوں کا تذکرہ دشوار ہے، اسلئے صرف ان ہی اصحاب کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ جن سے ہم واقف ہوئے ہیں۔

(۱) گوپال راؤ صاحب ایکبوٹے

ایکبوٹے صاحب مہاراشٹر کے باشندے ہیں کم عمری میں باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ مگر باہمت فرزند نے تعلیم جاری رکھی۔ پنجاب یونیورسٹی سے منشی اور ادیب فاضل کے امتحانات میں کامیابی کے بعد وکالت کا امتحان دیا اور وکالت شروع کی، پھر انگریزی میٹرک سے لیکر بی اے اور ایل ایل بی کے امتحانات جامعہ عثمانیہ سے کامیاب کئے حیدرآباد کے سربرآوردہ وکلا میں شمار ہے۔ کانگریس کے سرگرم رکن ہیں، اس سلسلہ میں منسٹری کی خدمت پر مامور کئے گئے اور

کئی سال تک نہایت خوش اسلوبی سے اپنے تحت کے صیغوں تعلیمات، حکومت مقامی، بلدیہ وغیرہ کی بہترین کارکردگی موجب بنے۔ تصنیف و تالیف کا شوق رہا کئی مقالے قلمبند کئے جو مقامی اردو اخباروں میں شائع ہوئے اور پسندیدہ نظروں سے دیکھے جاتے رہے، سیاسی کاموں کے ساتھ آپ کو ملک کی معاشرتی حالات سے بھی دلچسپی رہی عرصہ تک یتیم خانہ انیس الغربا کے صدر رہے اور اس یتیم خانہ کے انتظامی امور کو دلچسپی سے انجام دیتے رہے۔ آپ کی اردو تقریریں دلچسپ پر از معلومات ہوتی ہیں۔ کئی علمی اور ادبی جلسوں کی صدارت بھی فرمائی ہے۔ اور مطلبے آپ کی ادبی دلچسپی کے آئینہ دار ہیں، مرزا عصمت اللہ بیگ کے مجموعہ کلام پر جو پیش لفظ لکھا ہے اسکا اقتباس بغرض نمونہ پیش ہے۔

"شعر و ادب کے میدان میں مزاح نگاری اپنا ایک الگ اور ممتاز ترین مقام رکھتی ہے، اور اس میدان میں وہی لوگ ابھرتے ہیں جنہیں فطرت کی طرف سے مخصوص مزاح اور ذہن و فکر کی دولت نصیب ہوتی ہو، زندہ دلی اور ظرافت ہر فرد کے حصہ میں نہیں آتی، ہر بذلہ سنج اسوقت تک شاعر و ادیب نہیں بن سکتا جبتک کہ فطری طور پر اس میں یہ صلاحیت موجود نہ ہو۔

عصمت اللہ بیگ عصمت قدرت کی طرف سے ایک ایسا دل و دماغ لیکر آئے تھے جسکی وجہ سے انکی زندہ دلی اور بذلہ سنجی نے شعر کا روپ اختیار کر لیا۔ اور ایسا دلکش روپ جو پھولوں کے تبسم کیطرح سدابہار اور سندر ہے[۱]"

---

[۱] انوار تبسم ص۱۲۔

(۲) جے وی نرسنگ راؤ صاحب ضلع عادل آباد کے متوطن اولاً جامعہ عثمانیہ سے استفادہ کیا اور پھر علیگڈھ اور بنارس سے ڈگریاں حاصل کیں وکالت کے سلسلہ میں منسلک ہو کر جلد نام آوری حاصل کرلی اور حیدرآباد کانگریس کمیٹی کے صدر چنے گئے، "تلنگانہ اور آندھرا کے انضمام کے موقع پر بڑی جدوجہد فرمائی۔ "تلنگانہ" کے لئے خصوصی امتیازات حاصل کرنے میں آپ کا بڑا حصہ ہے، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ کی جانفشانی اور تندہی سے "تلنگانہ" کو امتیازات اور مراعات ملے ہیں، اور اردو کو اسکا جائز مقام دلانے میں آپ کی کوشش فراموش نہیں کیجا سکتی۔ اکثر تقاریر اردو میں فرماتے ہیں، جو معلومات آفریں اور دلچسپ ہوتی ہیں۔

(۳) ڈاکٹر راج بہادر گوڑ گوڑ خاندان آصفجاہ اول کے ہمراہ شمالی ہند سے دکن آیا تھا۔

راج بہادر صاحب کی ولادت ۱۹۲۰ء میں حیدرآباد میں ہوئی، جامعہ عثمانیہ میں تعلیم پائی، میڈیکل کالج سے یم بی بی یس میں کامیابی حاصل کی۔ کیمونسٹ پارٹی کی جانب سے دہلی میں راجیہ سبھا کے رکن ہیں۔ حیدرآباد ٹریڈ یونین کے جنرل سکریٹری اور کیمونسٹ پارٹی کے سکریٹری ہیں ۱۹۴۶ء میں حکومت آصفیہ نے آپ کو نظر بند کر دیا تھا، محب وطن، غریبوں کی خدمت کرنے والے ایثار کے حامل ہیں۔

اردو سے پوری دلچسپی ہے، آندھرا اردو کانفرنس میں آپ کا خطبہ صدارت معلومات آفریں اور ٹھوس تجویزات کا حامل تھا، نمونہ ملاحظہ ہو۔

"لیکن محض بیداری سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہونگے ضرورت وسائل کو اکٹھا کرنے اور تنظیم کو مضبوط کرنے اور اس میں مرکزیت پیدا کرنے کی ہے، جس طرح ہماری مذہبی ضروریات کی تسکین کیلئے

مذہبی ادارے موجود ہیں اور جس طرح ہمارے سیاسی مقاصد کی تکمیل کیلئے سیاسی تنظیمیں موجود ہیں، اسی طرح ہمارے وسیع تعلیمی اور تہذیبی اغراض کو پورا کرنے کیلئے ایسی تعلیمی اور تہذیبی تنظیمیں بھی ضروری ہیں، جو بلا لحاظ مذہبی عقائد اور سیاسی مکتب خیال ہماری تعلیمی و تہذیبی ضروریات کو پورا کریں"۔ (ہماری زبان علی گڈھ اکتوبر ۱۹۵۶ء)۔

(۴) بھارت چند صاحب کھنہ آپ کا خاندان اگرچہ پنجاب سے تعلق رکھتا ہے مگر اب عرصہ دراز سے حیدرآباد کو اپنا وطن بنا لیا ہے، اور کھنہ خاندان اب حیدرآباد کا ایک مشہور اور معزز خاندان شمار ہوتا ہے بھارت چند صاحب کی ولادت ۱۹۱۴ء میں ہوئی، آپ کے بڑے بھائی اقبال چند صاحب مہاراجہ کشن پرشاد کے داماد اور سرکار عالی کی ملازمت میں شامل تھے۔ اس طرح بھارت چند صاحب کی تعلیم و تربیت حیدرآباد میں ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ سے ایم اے میں کامیابی حاصل کی۔ یم اے میں آپ کے مقالہ کا عنوان فیروز شاہ تغلق تھا، جامعہ عثمانیہ کی تعلیم کے بعد آپ انگلستان گئے اور کیمبرج سے تاریخ اور قانون میں بی اے آنرز کی ڈگری لی، واپسی کے بعد ۱۹۴۱ء سے سرکاری ملازمت میں شامل ہوئے پبلک سروس کمیشن کے سکریٹری ہوئے اور اب ڈپٹی چیف سکریٹری ہیں۔

بھارت چند صاحب ایک طرف ٹینس، کرکٹ، ہاکی وغیرہ کھیلوں کے ماہر ہیں تو دوسری طرف وہ ایک اچھے ادیب اور ماہر فن مزاحیہ نگار بھی ہیں اب تک دو کتابیں "مسکراتے آنسو" اور "مصیبتیں" شایع ہوئی ہیں۔

اول الذکر کتاب کا پیش لفظ آغا محمد اشرف صاحب نے لکھا ہے جس میں

موصوف نے یہ بالکل صحیح صراحت کی ہے کہ :-

"اونھوں نے زندگی کے واقعات کو خوب غور سے دیکھا ہے اور ایسی اجزائے پریشاں کے مجموعے کو کہانی کی شکل میں سنایا ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کے افسانے حقیقت بردار ہوتے ہیں اور انکو دیکھکر ہماری آپ کی تصویر سامنے آجاتی ہے، کھنہ صاحب زندگی کی سچی اور اصلی تصویر پیش کرتے ہیں، افسانے پر لطف اور شگفتہ ہوتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے سماج کی بے اعتدالیوں اور غلط کاریوں کا بڑی گہری اور عمیق نظر سے مطالعہ کیا ہے، اور اس تجربے کو صفحہ قرطاس پر افسانہ کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

کھنہ صاحب طنز کے تیز نشتر سے سماج کی دکھتی رگوں پر نشتر لگاتے ہیں، لیکن ساتھ ساتھ حقایق کی تلخی کو اسلوب بیان کی شیرینی اور طرز تحریر کی دلکشی کے پردہ میں پیش کرتے ہیں، تشبیہیں انوکھی اور نرالی، تمثیلیں جدت آفریں ہوتی ہیں۔

تمام افسانے روزمرہ زندگی کے واقعات اور حوادثات پر مبنی ہیں یہ صرف تفریح طبع اور مزاح کیلئے نہیں ہوتے بلکہ ہر افسانہ سبق آموز اور عبرت انگیز ہوتا ہے، آپ معمولی واقعات کو اس طرح ایک شیرازہ میں منسلک کردیتے ہیں جن سے بہتر شائد ہی ہو اور پھر ان سے زندگی کے سدھار میں مدد ملتی ہے اور اور وہ درس جرأت دیتے ہیں، افسانہ نگاری اور مزاحیہ نگاری کے جسقدر خصوصیات ہوتی ہیں وہ سب کے سب آپ کے افسانوں میں نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں۔ کھنہ صاحب نے اپنے ایک مضمون میں بتایا ہے کہ ادب میں زندگی کی عکاسی کرنی چاہئے اور اسے سدھارنا چاہئے۔ یہ دونوں باتیں آپ کے یہاں

بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں، بہرحال آپ کے افسانوں کو درجہ اول کے افسانوں میں شمار کرنا چاہیئے۔

آپ کے افسانہ کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"غرضکہ استرے اور داڑھی کے اس جھگڑے میں آپ خود ہی اندازہ لگائیے کہ میرے گالوں کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔ جب میں اپنی طرف سے حجامت کر چکتا تو خون سے شرابور ہوتا۔ دو تین منٹ میں ضروریات سے فارغ ہو کر جلدی سے کوٹ پتلون اور قمیص میں گھس جاتا اور جماعت لینے کیلئے پاگل کتے کی طرح آندھی کی طرح اپنے کمرے سے بھاگتا تو سامنے سے نور محمد نہایت سنجیدگی سے ملتا اور کہتا کہ "صاحب چھوٹا حاضری تو کھاتے جایئے اور آج آپ نے نکٹائی کیوں نہیں لگائی؟" یہ سنکر میرا ہاتھ بے اختیار گلے پر پڑتا جہاں بجائے نکٹائی کے خون کے پرنالے استرے کی تیزی اور وقت کی تنگی کی داد دیتے ہوئے میرے ہاتھوں سے لپٹ جاتے۔ مگر اس کمبخت نور محمد کو میرا خون بہتا دیکھکر رحم نہ آتا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ ہی دیر سے آتا۔ اور میں ہمیشہ ہی خون آلود ہاتھوں سے ایک لمحہ میں نکٹائی کا پھندہ گلے میں ڈالکر پھر جماعت کی طرف بھاگتا۔ یقیناً لڑکے میری حالت کو دیکھکر یہ سمجھتے ہونگے کہ یا تو میں رات کو کسی بلی کے ساتھ سویا ہونگا یا اسکول کے پہلوان صاحب سے کل شام تکرار ہوگئی ہوگی۔" (از نوکر۔ مسکراتے آنسو صفحہ ۱۳۴)۔

"بچہ جاگ اٹھا اور میں نے اسکو اپنی گود میں بٹھالیا

میں نے سوچا کہ بیوی سے تو محبت کی دو باتیں کرنے کی امید نہیں اس لئے

بیوی نہ سہی بچہ ہی سہی   ہم پیار کریں گے کہیں نہ کہیں

دفعتاً بیوی نے ایک کاغذ سے نظر اٹھائی اور تمسخرانہ انداز سے کہا "اوہو باپ بچے کو گودی میں لئے بیٹھا ہے"۔

میں نے جل کر جواب دیا "اور ماں کتابیں لکھ رہی ہے اور باپ اور بچے دونوں کی پروا نہیں کرتی"۔

امید تھی کہ کوئی کرخت جواب ملے گا۔ مگر بیوی صاحبہ کسی بات پر خوش تھیں بولیں "میرے ایک قلمی دوست کا خط آیا ہے انہوں نے میرے مضمون کو بہت پسند کیا ہے"۔

میں نے قلمی سیب اور آم سنے تھے، بلکہ کبھی کبھی قلمی بڑدل کا بھی تذکرہ سنا تھا مگر قلمی دوست کے نام سے میں چکرایا بارے قسمت مجھے قلمی دوستوں کا مزہ بھی چکھنا تھا۔ میں نے دل پر جبر کرکے پوچھا یہ قلمی دوست کیا بلا ہے"۔ (ادیب جی کی مسکراتے آنسو ص۱۲)

(۵) سنہا

سری کشن صاحب سنہا، حیدر آباد کے متوطن ہیں انکے اجداد زنلام سے آکر یہاں بس گئے تھے، زنلام میں آپ کے اجداد وزیر اعظم کی خدمت پر مامور تھے، سنہا صاحب کی پیدائش حیدر آباد میں ۱۹۱۹ء میں ہوئی، حیدر آباد کے کایستھ خاندانوں میں آپ کا خاندان بھی معززین میں شمار ہوتا ہے۔ سری کشن صاحب کی تعلیم اردو، فارسی اور انگریزی میں اولاً گھر پر ہوئی، پھر سٹی کالج میں شریک ہوئے، جامعہ عثمانیہ سے بی اے

کی ڈگری حاصل کی۔ اکثر مضامین میں آپ نے امتیازی نمبر پائے" امتیازی قابلیت کا وظیفہ پایا۔ جامعہ کی زندگی بڑی شہرت سے بسر کی، انگریزی اور اردو مقرر کی حیثیت سے آپ نے نام آوری حاصل کرلی تھی۔ سلیس اور شستہ اردو اور انگریزی کہنے میں کمال پیدا کیا تھا، تعلیم کے زمانہ ہی سے ادیب کی حیثیت سے اچھی شہرت حاصل کی۔ آپ کے مضامین اور افسانے اردو کے معیاری رسالوں زمانہ، ساقی، سب رس اور مجلہ عثمانیہ وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں، حیدرآباد سیول سروس میں کامیابی حاصل کی اولاً دوم تعلقداری اور پھر اول تعلقدار (کلکٹر) بنے اسوقت مرکزی حکومت میں ڈپٹی سکریٹری کے عہدہ پر مامور ہیں۔ سنہا صاحب کے افسانوں کی دو کتابیں "زمین کانپ رہی تھی" اور "رم جھم" شائع ہوچکی ہیں، آپ ایک ترقی پسند افسانہ نگار ہیں اسلئے آپ کے یہاں مزدور، قحط، سرمایہ داری، بھوک سب کچھ موجود ہے، مگر عریانی نہیں ہے، طرز بیان آسان عام فہم ہوتا ہے تشبیہیں دلکش اور دل نشین ہوتی ہیں، کہیں کہیں طنز کی ہلکی چاشنی بھی ہوتی ہے حقیقت نگاری اور فلسفیانہ سوچ بچار، خیالات کی پختگی آپ کے افسانوں کے خصوصیات ہیں، مسلم سلاطین دکن، کے نام سے آپ نے ایک انگریزی کتاب بھی شائع کی ہے۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

"وہ بھاگ رہا تھا، اس کے جسم سے پھر پسینہ بہنے لگا، پسینے کی بوندیں ٹپ ٹپ زمین پر گرنے لگیں۔ شاید یہی وہ لذت کی بوندیں تھیں جنہیں پی لینے سے دھرتی ماتا ابھی تک اپنے وجود کو قائم رکھنے میں کامیاب رہی۔ کاش وہ اس طرح لہو پسینہ ایک نہ کرتا۔ وہ بھاگتا ہی گیا حتیٰ کہ یکایک اس کے

جسم میں رعشہ ہوا۔ سر چکرانے لگا۔ قدم ڈگمگانے لگے اور وہ کشا کے ساتھ دھڑام سے زمین پر گر گیا اسی وقت ایک خون کی قے ہوئی اور وہ بے سدھ پڑ گیا۔" (زمین کانپ رہی تھی ص۳۲)۔

"بابو صاحب کے جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ لڑکی جو آیندہ اتوار کو بھڑکیلی ساڑی چمکتے ہوئے زیور پہنکر دلہن بننے والی تھی۔ کچھ مسکراتے شرماتے میرے سامنے سے گذری پھر اس نے وار کیا اور میں نے اسکی چمکتی ہوئی مینا بدوش آنکھوں میں کسی کے دل کی دھڑکنوں کو دیکھا اس کے ابھرے ہوئے سینے میں جادوان خوشی کا زیر و بم اور گداز جسم کی پنہائیوں میں ایک رنگین محبت کی دلنواز ادائیں اس شعریت کے عالم میں رہ کر کپڑے پہنا اور باہر چل پڑا۔" (رم جھم ص۲)۔

(۶) مہندر راج سکسینہ مہندر راج سکسینہ کا تذکرہ شعرا کے ضمن میں بھی آگیا ہے، وہ ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں چونکہ اُنھوں نے نباتیات کے فن کی ڈگری لی اور جامعہ عثمانیہ میں اس شعبہ کے پروفیسر ہیں اسلئے اس فن پر مضامین اور کتابیں لکھا کرتے ہیں، آپ کی ایک کتاب "چیونٹی" ہے۔ اس میں آپ نے نہایت تفصیل کے ساتھ چیونٹی پر روشنی ڈالی ہے، خاصی ضخیم کتاب ہے اور پانچ باب میں منقسم ہے۔ چونکہ یہاں کتاب پر تبصرہ مقصود نہیں ہے اسلئے صرف عبارت کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:۔

"شاید دنیا کے اور کسی جاندار میں مل جل کر رہنے کی اتنی صلاحیت نہیں جسقدر اس چھوٹی سی مخلوق چیونٹی میں ہے، شروع برسات میں ایک آدھ جھڑی برس جانے کے بعد جب زمین نم ہو جاتی ہے

ہم انکے جھنڈ کے جھنڈ خانہ باغ میں، انگن میں، مدرسہ جاتے ہوئے راستہ میں، غرض ہر جگہ لمبی لمبی قطار بنائے گھروں سے نکلتے دیکھتے ہیں، اور یہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ یہ ننھی سی جان کبھی نچلی نہیں بیٹھتی، کتنی محنت کرتی ہے، جب دیکھو اسے کام میں لگی ہوئی پاؤ گے، یا تو وہ برسات کی آمد کے ساتھ اپنے گھروں کو کوڑا کرکٹ، غیر ضروری کنکروں یا تنکوں سے پاک کرتی نظر آئیں یا غذا کی تلاش اور باربرداری میں پھرتی دکھائی دیں گی۔"

(۷) گرو داس

راجہ گرو داس صاحب کے نانا راجہ تیجرائے صاحب کا ذکر قبل ازیں ہو چکا ہے۔ آپ کی ولادت حیدرآباد میں ہوئی، آپ کا سن صرف چھ ماہ کا تھا والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اسلئے بچپن سے نانا کے زیر پرورش رہے، ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، اردو، فارسی اور انگریزی کی تعلیم پاتے رہے، چھ سال کی عمر میں مدرسۂ مفید الانام میں شریک کئے گئے اسکے بعد آپ کو مدرسہ عالیہ میں شریک کیا گیا اور بورڈنگ میں رہنے لگے، ۱۹۲۳ء میں میٹرک کی کامیابی پر جامعہ عثمانیہ میں شریک ہوئے اور یف اے پھر بی اے میں کامیابی حاصل کی۔ یف اے کی کامیابی کے بعد آپکے مہربان اور پرشفقت نانا کا بھی انتقال ہوگیا۔ نانا کے بعد جاگیرات وغیرہ آپ کے نام بحال ہوگئے۔

گرو داس صاحب کو قومی اور ملکی کاموں سے بیحد شغف رہا ہے

؎ چیونٹی۔

انجمن طیلسانین عثمانیہ کے روحِ رواں رہے، بلدیہ اور دیگر رفاہی کاموں میں حصے لیتے رہے ہیں، چونکہ ہم کو سیاسی کاموں کا تذکرہ مقصود نہیں ہے اسلئے انکو نظرانداز کر کے علمی کاموں کی صراحت کرتے ہیں، زمانہ تعلیم ہی سے آپ کو تقریر اور تحریر سے دلچسپی رہی، مضامین قلمبند کرتے تھے آپکی مستقل تصنیف "جیون چرتر" یعنی راجہ تیجرائے صاحب کی سوانح عمری ہے، اپنے شفیق نانا کی یاد کو تازہ رکھنے کیلئے آپ نے مختصر مگر جامع سوانح عمری شائع فرمائی ہے، ڈاکٹر زور صاحب نے اپنی کتاب "عہد عثمانی میں اردو کی ترقی" میں راجہ گردھاری داس سے متعلق حسب ذیل صراحت فرمائی ہے :- "جانکی پرشاد صاحب راجہ گردھاری داس صاحب اور رجے شنکر راؤ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، ان سبھوں نے اپنی کتابوں اور مضامین کے ذریعہ اردو کی ناقابل فرد گذاشت خدمات کی ہیں"۔ (صفحہ ۱۳۱)۔

راجہ گردھاری داس صاحب کی اس مستقل کتاب کے علاوہ ان کے خطبات صدارت بھی ہر آئینہ قابل ستائش ہیں، آپ کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

"نواب سر آسمانجاہ کا انتقال جب صفر ۱۳۱۶ھ میں ہوا اس کے بعد ایک روز آپ (تیجرائے) اچانک زینہ سے گر گئے جس سے کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ جیسا کہ قبل ازیں کسی باب میں بتلایا گیا ہے۔ ایک ماہ سے زیادہ آپ فریش رہنے کے بعد جب آپ کو صحت کلی حاصل ہوئی پھر بھی معالج ڈاکٹر کی رائے تھی کہ آپ بالکل آرام حاصل کریں لیکن آپ کو ہمیشہ بیکاری سے نفرت تھی، اسلئے آپ کو نواب سر آسمانجاہ بہادر مرحوم و مغفور کی سوانح عمری شرح و بسط کے ساتھ لکھنے کا

خیال پیدا ہوا، جسکی وجہ زیادہ تر یہی تھی جو وقت بیکاری میں صرف اور رائیگاں جائیگا اس سے بہتر کہ وہ وقت کسی اچھے کام میں صرف کیا جائے تو اسوقت بلحاظ تعلق قدیمانہ جو اس پائیگاہ ابدمدت سے اس خاندان کو پانچ پشت سے ہے خصوص نواب سر آسمانجاہ نے جس پدرانہ شفقت سے آپ کو پرورش فرماکر سرفراز و ممتاز فرمایا تھا اسکو فراموش کرنا سراسر کورنمکی تھی۔ اسلئے آپ نے ایک مکمل سوانح عمری نواب سر آسمانجاہ مرحوم و مغفور صفر ۱۳۲۰ھ میں لکھنا شروع کیا"۔

جیون چتر (صفحہ ۴۸ و ۴۹)۔

(۸) ہری لال صاحب واگھرے

ہری لال صاحب واگھرے خاندان کے سپوت ہیں جامعہ عثمانیہ سے طیلسان حاصل کیا ہے پھر ایف' آر۔ ای۔ یس (کامرس) میں کامیابی حاصل کی۔ اردو زبان سے دلچسپی ہے۔ آپ کو تاریخ سے زیادہ شغف ہے۔

"جیون چتر" پر بڑا اچھا انٹروڈکشن (پیش لفظ یا تعارف) لکھا ہے نمونہ حسب ذیل ہے:-

"دنیا میں اگر کوئی قوم اپنی ہستی کو برقرار رکھکر تمدن اور ترقی کے میدان میں قدم بڑھانا چاہتی ہے تو اسکے افراد کیلئے لازم ہے کہ اپنی قوم کے تاریخی واقعات اور حالات اور محترم لیڈروں کی سوانح عمری حوالہ قلم کرے۔ آج کل دنیا کی مہذب اقوام اپنے بزرگوں اور قابل پیشروں کی یادگاریں ان کے کارنامے چھپواکر آنے والی نسلوں کو اپنی ہستی برقرار رکھنے

کیلئے بطور مثال پیش کر رہے ہیں، چنانچہ مشاہدہ اس بات کا کافی ثبوت دیتا ہے کہ جرمن، فرانس، امریکہ، انگلینڈ وغیرہ میں جو بیداری نظر آرہی ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے۔"

(۹) برج لال برج لال صاحب حیدرآباد وطن جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل تصنیف و تالیف سے دلچسپی ہے "اخلاقی مضامین" کے عنوان سے آپ کا ایک رسالہ شائع ہوا ہے، ڈاکٹر زور نے پیش لفظ لکھا ہے۔

عبارت کا نمونہ

"علم تاریخ ہی کی برکت ہے کہ گذشتہ زمانہ کی آئین۔ قومی قوانین ملکی طریق۔ مذہبی احکام کا ذخیرہ ہمارے سامنے مہیا ہے۔ اور اسکی برکت سے گذشتہ سلطنتوں کا حال انکی ترقی تنزل کے اسباب بخوبی معلوم ہو رہے ہیں، جس سے ہم بہت کچھ فائدہ اٹھا رہے ہیں اور تنزل کے اسباب سے بچتے اور ترقی کے اسباب کو اختیار کرتے ہیں۔"

(۱۰) بالاپرشاد گوڑ حیدرآباد کا گوڑ خاندان اپنی علمی قابلیت اور سیاسی کاموں کے باعث مشہور ہے، بالاپرشاد صاحب نے جامعہ عثمانیہ سے استفادہ کیا ہے۔ آپ کے مضامین اور افسانہ ہندوستان کے مشہور رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"بیاہ کے بعد چند مہینوں تک شرمیتی جی نہایت خاموشی سے گھر کے کام کاج میں گذارتی رہیں۔ سگھڑ بہو کا کام پیارا ہوتا ہے ساس کے دل پر چڑھ گئیں۔ زمانہ بدلا، حالات بدلے ہمارے

ڈھنگ بدلے، ہمارے دل بدلے، گرانی اپنے لانبے لانبے ڈگ بھرتی ہوئی زمانے سے آگے نکل گئی۔ پرانے گھرانوں نے ریت بدلتے نہ چاہنے پر بھی ہر ایک اپنی اپنی سوچنے لگا۔ چنانچہ ہمارے گھر میں بھی پھوٹ پڑ گئی، اور میرا چولھا ایک الگ ہو گیا۔ یہ سب تبدیلی اتنی آہستہ آہستہ ہوئی کہ زندگی کی دوپہر تک ہمیں اسکا پتہ نہ چلا، اتنے عرصہ میں شریمتی جی پانچ بچوں کی ماں بھی ہو گئی تھیں۔

میں نے یہ کہنا بھول گیا کہ شریمتی جی کی تعلیم کہاں تک ہوئی تھی، بیاہ سے پہلے کچھ مڈل پاس تھیں، مگر بیاہ کے بعد معلوم ہوا کہ بارہ گھڑی پڑھ سکتی ہیں[لہ]۔"

(۱۱) بلبیر پرشاد

حیدرآباد وطن جامعہ عثمانیہ سے یم۔اے اور پھر ایم ایڈ میں کامیابی حاصل کی ہے، ٹریننگ کالج میں پروفیسر ہیں، اردو سے بڑی دلچسپی ہے، آپ کا ایم اے کا مقالہ چکبست اور انکا کلام" اور یم ایڈ میں" جماعت ہائے تحتانیہ کی اردو ہندی درسی کتابوں کے مشترک الفاظ پر" قلمبند فرمایا تھا۔

حیدرآباد کے رسالوں میں آپ کے مضامین بھی شائع ہوتے ہیں، آپ کی عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"غرض ان تمام باتوں سے ہندوؤں کی اردو دوستی مسلم ہے لیکن افسوس ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے ارباب حل وعقد نے

لہ رسالہ نگار بابتہ جنوری ۱۹۵۱ء۔

اپنے ہندو منشیوں کو اردو کو ہندی رسم الخط میں لکھنے کا حکم دیکر ایک بڑا زہریلا بیج بویا۔ اور غدر کے بعد راجہ شیو پرشاد اور بھارتیندو ہرشیس چندر ہندی کے فروغ کی تحریک سے اپنے دامن کو وابستہ کر کے اردو کے درپے آزار ہو گئے۔ اگرچہ لطف کی بات یہ ہے کہ اول الذکر ایک اردو کتاب کے مصنف اور ثانی الذکر اردو کے اچھے شاعر تھے[1]۔"

(۱۲) راما نج راؤ | دیول پلی راما نج راؤ حیدرآباد کے باشندہ ہیں دیول پلی آپ کا مولد ہے، تلنگی اور اردو زبان کے ادیب ہیں، تلنگی ادب میں بڑی نام آوری حاصل کی ہے، جامعہ عثمانیہ کے قابل سپوتوں میں شمار ہوتا ہے۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"گولکنڈہ کی سلطنت کے زمانہ میں تلنگی کو فارسی اور دکھنی کے ساتھ مساوی رتبہ ملا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور میں تلنگی ادب نے بہت زیادہ ترقی کی۔ اس دور کی ایک ایسی کتاب بھی ملتی ہے جس میں سنسکرت زبان کا ایک بھی لفظ نہیں ہے۔ اس طویل نظم کا نام "اے یاتی چرترا" ہے۔ اس کتاب کو قطب شاہی سلاطین کے ایک سپہ سالار امین خاں کے نام معنون کیا گیا ہے۔ اس طویل نظم سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بعض گوشوں میں یہ بھی خیال تھا کہ تلنگی زبان کے خاص روپ کو نمایاں کیا جائے قطب شاہی سلطنت کے زوال کے بعد تلنگی ادب کی ترقی

---

[1] سب رس اپریل ۱۹۴۴ء۔

کے راستے میں بڑی بڑی دقتیں پیدا ہوگئیں۔ آصفجاہی سلطنت نے تلنگی ادب کی سرپرستی کرنے میں قطب شاہی روایت کو زندہ نہیں رکھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تلنگی ادب کی ترقی کی قدیم رفتار باقی نہ رہ سکی[۱]۔"

(۱۳) امر بھارتی جامعہ عثمانیہ کے ایک مشہور فرزند ہیں۔ علم سے دلچسپی ہے اردو اخباروں میں آپ کے بلند پایہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔

"آندھرا یا تلگو زبان بولنے اور کہنے والوں کی تاریخ کافی پرانی ہے قدیم کتابوں میں آندھرا قوم سے متعلق بہت سے حوالے ملتے ہیں، تین ہزار سال پرانی اس قوم کی تاریخ اور اسکی طاقت کا اندازہ مہاتما بدھ اور مہاراجہ اشوک کے زمانہ کے ہندوستان کو بخوبی ہوچکا تھا، بدھ مت کو آندھرا عوام اس دور میں جزائر انڈونیشیا، سیام اور کمبودیا تک لیجا چکے تھے ۱۰۶۰ سال قبل مسیح میں آندھرا عوام نے مہاراج شال واہن کے دور میں دیش پر ٹوٹ پڑنے والی دشمن کی طاقتوں کو پسپا کرکے ہمیشہ کے لئے اپنی طاقت کا لوہا منوالیا تھا۔ دراصل یہیں سے آندھرا عوام کے شال واہن شک (سال) کی ابتدا ہوتی ہے "شال واہن شک" آندھرا عوام کے شاندار فتح کی عظیم الشان یادگار ہے[۲]۔"

(۱۴) رامچندر پرشاد رامچندر پرشاد صاحب کایستھ قوم سے تعلق رکھتے

---

[۱] اخبار پیام کیم نومبر ۱۹۵۶ء۔

ہیں، جامعہ عثمانیہ سے ایم اے کی ڈگری لی ہے، کالج میں لکچرار ہیں، سب رس وغیرہ رسالوں میں آپ کے مضامین شائع ہوتے ہیں، آپ کی کتاب "انسانیت" اردو زبان کی بلند پایہ کتابوں میں شمار ہوتی ہے، عبارت کا نمونہ۔

"وحشی تمدن کے دور کو پھر ہم تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، جیسا کہ انسان پتھر کے ہتیار بنانے کی پہلی کوشش اور آگ کی دریافت میں لگا ہوا تھا اور ابھی اس نے پوری طرح بات چیت کرنا بھی نہیں سیکھا تھا، اس قسم کی کوئی نسل اب نظر نہیں آتی۔

آہستہ آہستہ انسان نے پتھر کے بھدے ہتیار بنانے شروع کئے اور ہتیاروں سے وہ چھوٹے چھوٹے جانوروں کو مارنے لگا انسانی تمدن کا یہ ایسا زمانہ تھا جبکہ انسان غاروں میں رہتا تھا درختوں یا وادیوں میں پناہ حاصل کرتا تھا، ہم سمجھ سکتے ہیں کہ چرند اور پرند کو پکڑنا یا مارنا بھی اسکے لئے کتنا مشکل نہ ہوگا۔"

آدی واسیوں کے تمدن پر ایک نظر کے عنوان سے ایک دلچسپ مقالہ ہے اس کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"بعض آدی واسی اپنی تاریخی اہمیت کی وجہ سے اہم ہیں، ان میں گونڈ اور سوارا قابل ذکر ہیں، ہندوؤں کی مذہبی اور مقدس کتابوں مثلاً مہابھارت، رامائن اور ...... یا برہمی میں ان کا ذکر آتا ہے قدیم زمانے کے کتبات سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے حکمرانی بھی کی تھی یہ ایک جنگجو قبیلہ تھا جو تلنگانہ کے راجاؤں کی

ے سب رس مئی ۱۹۵۲ء۔

طاقت اور حکومت کے سامنے نہیں ٹک سکا اور آخر میں وزیگاپٹم کے جنگلات میں آباد ہونے پر مجبور ہوا‘ اونچی پہاڑیوں‘ بہتے جھرنوں‘ ہرے بھرے جنگلوں اور گہری وادیوں جیسے خوبصورت مناظر کے بیچ سوارا آباد ہیں‘ رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ انکے تمدن میں بھی کافی تبدیلیاں آچکی ہیں[۱]۔"

(۱۵) بال ریڈی تلنگانہ کے ایک معزز ریڈی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں‘ جامعہ عثمانیہ سے استفادہ کیا ہے۔ بی اے اور بی ٹی (ڈپ ایڈ) میں کامیابی حاصل کی ہے‘ سررشتہ تعلیمات میں ملازم تھے اور ناظری کی خدمت سے پچپن سالہ عمر میں وظیفہ حاصل کیا‘ اصلاحی‘ تعلیمی اور تاریخی مضمون بہت اچھے لکھا کرتے ہیں‘ جو سبق آموز اور معلومات آفریں ہونے کے علاوہ دلچسپ بھی ہوتے ہیں‘ عبارت صاف اور سادہ ہوتی ہے اور خیالات کی گہرائی آپ کے وسیع مطالعہ کا پتہ دیتے ہیں‘ اور تقریر کا بھی بخوبی ملکہ حاصل ہے‘ عبارت کا نمونہ پیش ہے:۔

"ہندوستان کے باہر ہندوستانی زبانوں میں سے بھی (اردو) زبان زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ممالک غیر میں بھی اس کو بین قومی حیثیت حاصل ہے‘ حجاز‘ اور عراق میں تمام ہندوستانی اسی زبان میں آپس میں تبادلہ خیال کرتے ہیں‘ اور اسی طرح چین اور ہانگ کانگ وغیرہ میں بھی اسی سے کام لیا جاتا ہے۔

اردو نہ صرف ہماری ریاست بلکہ کل ہند اور بیرون ہند

---

[۱] اخبار ملاپ یکم نومبر ۱۹۵۶ء

کے لئے بھی اہم ہے، کشمیر سے لیکر راس کماری بلکہ لنکا تک اور بلوچستان سے لیکر برما تک یہی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں کا جاننے والا جیسے ملایالم، تامل، تلنگی، مرہٹی، بنگالی، سندھی، گجراتی، پنجابی وغیرہ بولنے والا ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں چلا جائے تو وہ وہاں اجنبی ہوجاتا ہے کیونکہ نہ تو وہ وہاں کی بولی سمجھتا ہے اور نہ اسکی بات وہاں سمجھی جاتی ہے مگر اردو بولنے اور سمجھنے والا ہندوستان کے کسی خطے میں بھی کسی دشواری سے دوچار نہیں ہوتا۔" (سب رس ستمبر ۱۹۴۲ء)

(۱۵) برج لال

آپ ایک معزز کایستھ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جامعہ عثمانیہ سے بی اے میں کامیابی حاصل کی ہے، اردو ادب سے خاص دلچسپی ہے۔ "ادارہ اشاعت علوم وفنون" کے معتمد ہیں، ادارہ کی جانب سے کئی اچھی اچھی کتابیں اردو میں شائع فرمائی ہے۔ ایک ماہوار رسالہ "رہبر تعلیم" بھی کچھ عرصہ تک شائع کرتے رہے ہیں۔

(۱۶) دھرنی دھر سنگھی

حیدرآباد دکن سنگھی خاندان کے سپوت جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل۔ وکالت پیشہ "میر بلدیہ" بھی ہوئے تھے، اردو سے دلچسپی ہے، سیاست کے بھی مرد میدان ہیں۔ "وفاق اور ہم" نام سے ایک مقالہ شائع کیا ہے۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"بٹلر کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی ہی تھی کہ برٹش انڈیا کے دستوری مسائل کے متعلق رپورٹ پیش کرنے کیلئے سائمن کمیشن کا تقرر فرمایا گیا۔ دوران تحقیقات میں اس کمیشن کو بھی دستوری نقطہ نگاہ سے مجبوراً برٹش انڈیا اور دیسی ریاستوں کے آئندہ تعلقات کے

تعین کے متعلق غور کرنا پڑا چنانچہ اس مجبوری کا اظہار رپورٹ کے جلد دوم صفحہ (۹) پر کیا گیا[1]۔"

(۱۷) بی ایس راؤ سری نواس راؤ صاحب عام طور سے بی ایس راؤ کے نام سے مشہور ہیں، ضلع محبوب نگر کے متوطن ہیں، ۱۹۱۹ء میں تولد ہوئے، جامعہ عثمانیہ سے بی اے اور ایم اے میں کامیابی حاصل کی، سیاست آپ کا مضمون تھا، تعلیم کے زمانہ ہی سے سیاست سے دلچسپی رہی بعد کامیابی اخبار رعیت میں کام کرنے لگے، مسٹر نرسنگ راؤ کے دست راست اور خاص شاگردوں میں ہیں، عرصہ دراز تک "رعیت" کے اداریے آپ ہی قلمبند کرتے رہے، اور پھر ۱۹۴۷ء سے "رہنما اخبار" کے نام سے ایک اردو ہفتہ وار اخبار شائع کرتے رہے، تلنگی، انگریزی، اردو ترجمہ کی آپ کو خصوصی مہارت حاصل ہے، کسی کی اردو یا انگریزی تقریر کے بعد ہی فوراً اسوقت اسکا ترجمہ انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی میں کر دینے کی پوری مشق حاصل ہے، اسی طرح تلنگی زبان جو آپ کی مادری ہے اس میں بھی اسی طرح عبور رکھتے ہیں اور تلنگی زبان میں انگریزی یا اردو کو منتقل کر دینے کا پورا سلیقہ ہے اچھے مقرر ہیں، تقریر پُر زور اور اثر انداز کرتے ہیں۔

تاریخ آزادی ہند کے سلسلہ میں جو چار ریسرچ اسکالر مقرر ہوئے ہیں ان میں آپ بھی شامل ہیں۔

"آج ہم پر بڑی ذمہ داریاں عائد ہیں یہ ذمہ داریاں بھی ہمیں دنیا کے سامنے، تاریخ کے سامنے، آنے والی نسل کے سامنے، خدا کے

---

[1] وفاق اور ہم۔

سامنے جواب دینا ہے کہ آیا ہم نے اپنے ذمہ داریوں کو پورا کیا ہے۔ آج ہمارا اولین فریضہ یہ ہے کہ اس شمع کو گل نہ ہونے دیں، جو "باپو" نے روشن کیا تھا، اور اسکی روشنی کو پوری دنیا میں پھیلائیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو ہم اپنے حق میں، دنیا کے حق میں اور ملک کے حق میں غدار ثابت ہونگے، آئیے آج ہی ہم حلف اٹھائیں کہ ہم اپنے آقا، اپنے قائد، اپنے رہنما، اپنے راشٹر پتا کے نقش قدم پر چلیں گے، اور محبت صداقت اور رواداری کی قربان گاہ پر ہم اپنی ایسی ہی بھینٹ چڑھائیں گے جیسے کہ گاندھی جی نے چڑھایا ہے" (رہنما ہفتہ وار ۱۰ فروری ۱۳۵۷ف)۔

(۱۸) رائے محبوب نارائن محبوب نارائن نام گوڑ قوم سے تعلق رکھتے ہیں آپ کے اجداد فیض آباد سے آصفجاہ اول کے ہمراہ دکن آکر بس گئے اور مختلف خدمات انجام دیتے رہے، محبوب نارائن صاحب کی پیدائش حیدرآباد میں ۱۹۰۳ء میں ہوئی منشی، منشی فاضل کے علاوہ جامعہ عثمانیہ سے بی اے کی ڈگری حاصل کی ہے، شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی دنیا کے رسم الخط، عبدالرحیم خاں خان خاناں کی ہندی شاعری وغیرہ آپ کے تحقیقی مقالے ہیں۔

(۱۹) رنبیر جامعہ عثمانیہ کے قابل سپوت اردو سے پوری دلچسپی ہے اخباروں میں آپ کے افسانے اور مضامین شائع ہوتے ہیں

"بڑبڑا کر وہ جاگ اٹھے۔ اندھیرے میں آنکھ پھاڑ کر دیکھا کہ دن نہیں رات ہے۔ بازار نہیں اپنے کمرہ میں اپنے بستر پر بیٹھے ہیں اور بھیڑ نہیں روشن کی ماں زور زور سے خراٹے لے رہی ہے

کانپتے ہوئے پاؤں کو انھوں نے چارپائی سے نیچے رکھا، جوتی پہنی، ساتھ والے کمرے میں جاکر اسکی بتی جلادی دیکھا کہ روشن اپنے بستر پر گہری نیند میں سوئی پڑی ہے۔ بتی جلنے پر بھی جاگی نہیں۔

تب معلوم ہوا کہ وہ خواب دیکھ رہے تھے، خواب، لیکن کتنا بھیانک تھا وہ، اس کے بعد صبح تک وہ سو نہیں سکے۔[1]"

(۲۰) یس کیشوا نگار نظام کالج کے پروفیسر معاشیات، نظام ادب میں آپ کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔

"ہمارے ملک کے روغنی تخم کی حالت ویسی ہی ہے، جیسی کہ روئی کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تیار شدہ اشیاء کی درآمد اتنی ناقابل برداشت نہیں ہے جتنی کہ سوتی اشیاء کی ہے، ۱۹۴۷ء میں ہمارے ملک نے ۲۷ء۵۰۸ لاکھ روپے کے روغنی تخم ۱۱ء۱۴۱ لاکھ روپے قیمت کے نباتاتی روغنیات اور ۲۴ لاکھ روپے کی کھلی خالصتاً برآمد کی۔ کشیدگی روغن کیلئے ملک روغنی تخم کا بیرون ملک برآمد ہونا تعجب خیز امر ہے، بجائے روغنی تخم کے اگر روغنیات برآمد کئے جائیں تو دونوں کے لئے مفید ہوگا۔[2]"

(۲۱) یس ہنمنت راؤ یس ہنمنت راؤ صاحب نظام کالج میں تعلیم پائی۔ یم اے میں کامیابی حاصل کی تاریخ کے

---

[1] اخبار ملاپ یکم نومبر ۱۹۵۶ء۔ [2] نظام ادب ۱۹۴۳ء۔

متعلم رہے۔ دکن کی تاریخ سے خاص دلچسپی رہی، زمانہ تعلیم ہی میں کالج کے میگزین نظام ادب میں مضمون شائع کرتے رہے، عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"بیجانگر کی عورتیں فوج کا ساتھ دیتی تھیں، بیجانگر کی تاریخ میں محل کی بیگمات کا راجاؤں کے ساتھ لڑائی میں جانا کئی طرح سے ثابت ہوتا ہے، ۱۵۱۹ء میں جب کرشنا دیورایا نے کونڈاویڈد کا محاصرہ کیا تو اس کے ساتھ اسکی دو رانیاں چنا دیونیما اور ترمل دیونیما بھی تھیں۔ انہیں کے ساتھ کرشنا دیورایا "دھرنی کوٹا" کے نزدیک امریشور کے مندر کو گیا تھا، محل کی بیگمات شجاعت و بہادری کا نمونہ تھیں۔ اگر لڑائی میں راجہ کام آجاتا تو رانی لڑائی جاری رکھتی"[۱]

(۲۲) شنکر موہن لال ماتھر ماتھر صاحب جامعہ عثمانیہ کے سپوت ہیں رسالہ سب رس میں آپ کے مضامین شائع ہوتے تھے، نمونہ عبارت ملاحظہ ہو۔

"ادب کا موجودہ دور نفسیات کا دور کہا جا سکتا ہے، ادب اب محض تفنن کی چیز نہیں۔ تفنن کے سوا اس کا کچھ اور بھی مقصد ہے وہ محض ہجر و وصال کے راگ نہیں الاپتا اب وہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے۔ ان کا محاکمہ کرتا ہے اور انکو حل کرتا ہے"[۲]

(۲۳) جی مین ریڈی جامعہ عثمانیہ کے تعلیم یافتہ اور سب رس کے مضمون نگار، ادب کا خاص ذوق رکھتے ہیں،

---

[۱] نظام ادب ۱۹۳۱ء۔ [۲] سب رس بابتہ ۱۹۳۱ء۔

عبارت کا نمونہ۔

"یہ امر سب پر واضح ہے کہ ہندی اور فارسی کے ملاپ سے اردو زبان نے جنم لیا ہے۔ احتیاج کی ماں نے اسے لاڈ سے پالا اور اپنی آنکھوں سے اوجھل رہنا پسند نہ کیا ہوگا۔ لیکن لاڈلے بچے کا پاؤں ایک جگہ نہ ٹکا ہوگا احتیاج کی ماں نے اس پر نگرانی رکھی ہوگی۔[۱]"

(۲۴) گنیش چند جامعہ عثمانیہ سے بی اے اور بی ٹی کی ڈگریاں حاصل کیں اور سررشتہ تعلیمات میں ملازم ہوئے۔ سب رس کے مضمون نگار رہے، عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"مصطفےٰ کمال کی ترقی ترکوں کے تعلیم یافتہ حلقے میں ہوئی جہاں اس نے جلد تر اسکا مرتبہ حاصل کرلیا، اس کے جانشین کے زمانہ میں ترکوں کی ترقی یقینی ہے۔[۲]"

(۲۵) یس پی انتیا جامعہ عثمانیہ کے تعلیم یافتہ رسالہ سب رس کے مضمون نگار، افسانہ نگاری میں خاصا ملکہ پیدا کیا، اسکے افسانے دلچسپ اور ادر نتیجہ خیز ہوتے ہیں، ایک افسانہ کا مختصر نمونہ پیش ہے۔

"کچھ فاصلہ پر نشیب میں ریلوے لائن آگئی جس کے کنارے کنارے سنتری ٹہل رہا تھا۔ ریلوے لائن کے بالکل پیچھے مینار والا گرجا چمک رہا تھا جس کی چھت زنگ آلود تھی۔[۳]"

۱-۲-۳ سب رس

(۲۶) ہربنس سنگھ راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جامعہ عثمانیہ میں تعلیم پائی، رسالہ سب رس کے مضمون نگاروں میں شامل رہے ہیں، افسانہ نگاری کا شوق ہے، ایک افسانے کا کچھ نمونہ ملاحظہ ہو۔

"صاحب کوٹ پہن کر گھر سے نکلے تو کلّو نے اطمینان کا سانس لیا دو گھنٹے سے دل بری طرح دھڑک رہا تھا، سارا جسم پسینہ سے تر ہوا جا رہا تھا۔ پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے کونے میں پڑی ہوئی ردی کی ٹوکری میں سے پانچ کا نوٹ نکالا پانچ روپے اسکی سب سے بڑی چوری تھی۔

"پانچ کی پتی" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا اور ماتھے پر کا پسینہ جھٹک پڑا نوٹ کو نکر کے جیب میں ٹھوس کر وہ اپنے کمرہ میں چلا گیا اور ٹرنک کھول کر اپنی رنگین چارخانے والی بش شرٹ اور جین کی خاکی پینٹ نکالی اور گنگناتے ہوے پہننے لگا۔"[1]

(۲۷) وی کے ریڈی حیدرآباد کے ایک ریڈی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، خدمت وطن کا جذبہ رکھتے ہیں، اردو سے دلچسپی ہے، آپ کی کتاب "دکھی وطندار" نے بڑی مقبولیت حاصل کرلی۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"جہاں تک پٹیل پٹواریوں کے ظلم و ستم کا تعلق ہے وہ ایک

---

[1] سب رس ۱۹۵۵ء۔

وہمی اور تصوری چیز ہے۔ مظالم کی یہ خیالی تصویر حقایق سے دور اور گمراہ کن تخیلات کی پیداوار ہے۔ رعایا اور مہیں دیپواری شیر و شکر کی طرح رہتے سہتے آئے ہیں۔ ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ کسی مقدم موضع کے یہاں کوئی خوشی کی تقریب ہوئی ہو اور وہ اپنی عزیز جان رعایا اور ہم وطنوں کو مدعو نہ کیا ہو؛ اور عوام میں سے کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو اس خوشی کی تقریب میں خوشی خوشی سے شریک نہ ہوا ہو[1]۔"

(۲۸) وی ین پٹواری جامعہ عثمانیہ کے طالب علم ہیں ریاضی میں یم اے کیا ہے کئی ریاضی کی کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں، جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں، ہندسہ تحلیلی، ہندسہ مخروطات، تفرقی احصار، علم مثلث مستوی۔

(۲۹) رتن لال آپ بھی جامعہ عثمانیہ کے سپوت ہیں ریاضی آپ کا مضمون رہا۔ طلبہ کے لئے ریاضی کی کتابیں قلمبند کی ہیں جو یہ ہیں، جدید ابتدائی ریاضی حصہ اول و دوم، جدید ابتدائی مساحت، جدید ابتدائی ہندسہ۔

(۳۰) روی سنگھ جامعہ عثمانیہ سے استفادہ کیا ہے۔ ابتدائی نباتیات آپ کی تالیف ہے۔

(۳۱) سدرشن راج جامعہ عثمانیہ کے یم۔ ایس سی ہیں علم طبعیات کے چار حصہ قلمبند کئے ہیں۔

---

[1] دکھنی وطندار۔

(۳۲) یس شنکر راؤ جامعہ عثمانیہ کے طالب علم ہیں، آپ کا مقالہ "عطری ہیلائیڈز کی آب پاشیدگی اور الکحل پاشیدگی پر حل کیورک کلورائیڈز کا اثر" شائع ہوا ہے۔

صدر تذکرا اصحاب کے علاوہ فرزندان جامعہ عثمانیہ سے اور کئی ایک قابل سپوت اردو کی خدمت گزاری کے سلسلہ میں قابل تذکرہ ہیں مگر افسوس ہے انکے حالات اور نمونہ دستیاب نہیں ہوا۔ اسلئے سردست صرف ان کے اسماء گرامی پیش کردئے جاتے ہیں۔ تاکہ آئندہ کام کرنے والوں کو سہولت ہو سکے، یہ اصحاب حسب ذیل ہیں۔

آنجہانی سکسینہ صاحب جو جامعہ عثمانیہ میں تاریخ کے لکچرار تھے، فلسفہ کے لکچرار شیو موہن لال صاحب، راجوکر صاحب، سدیشور راج صاحب سکسینہ بھاسکر راج صاحب سکسینہ وغیرہ۔

مجھے افسوس ہے کہ ان اصحاب کے حالات شامل نہ ہو سکے، ان سب کے اردو خدمات قابل تحسین ہیں، اردو کی ترقی میں یہ اصحاب پوری طرح حصہ لے رہے ہیں، آئندہ زمانہ میں انکے کارناموں کو اجاگر کیا جا سکتا ہے۔

اس موقع پر جامعہ عثمانیہ کے بعض مقالوں اور مقالہ نگاروں کا تعارف کرانا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، ۱۹۴۸ء تک جامعہ عثمانیہ سے امتحانات ام اے کیلئے ایک مقالہ لکھنا ضروری تھا۔ اسکے علاوہ یم ایڈ اور یل یل ایم کے امتحانوں کیلئے مقالہ نگاری لازمی ہے، چونکہ ۱۹۴۸ء کے پہلے تمام مقالے اردو میں لکھے گئے ہیں اسلئے انکی مراجب بیجا نہیں ہوسکتی۔

یم ۔ اے

شمار	نام	مضمون	عنوان مقالہ
۱	بلبیر پرشاد صاحب	اردو	چک بست اور ان کا کلام۔
۲	گوبند راؤ پوار صاحب	فلسفہ	ویدانتی وحدالوجود
۳	رائے نارائن پرشاد صاحب	"	آر بندو گھوش کا فلسفہ
۴	بی کملا منوہر صاحب	عمرانیات	تعلقہ محبوب آباد کے لمباڑوں کی انسانیاتی اور سماجی سروے
۵	اے یس شام لال صاحب	"	تعلقہ ملگ کے کومٹون کی انسانیاتی اور سماجی سروے۔
۶	رام چندر پرشاد صاحب	"	بیڈروں کی انسانیاتی اور سماجی سروے۔
۷	ڈی اننت راؤ صاحب	"	ضلع عادل آباد کے گونڈوں کی تہذیب ہندوانی تہذیب کا اثر۔
۸	راجندر راؤ صاحب	"	دکن وشنو برہمنوں کی سماجی اور تمدنی زندگی۔
۹	ایم نارائن راؤ صاحب	"	حیدرآباد میں سماج سدھار کے بعض اہم ادارے اور تحریکیں
۱۰	سی وی رام راؤ صاحب	معاشیات	حیدرآباد اور کساد بازاری۔
۱۱	سی یس وینکٹ راؤ صاحب	"	بلدہ حیدرآباد اور سکندرآباد کے مزدوروں کے گھروں کی حالت۔

شمار	نام	مضمون	عنوان مقالہ
۱۲	بی نارائن سوامی صاحب	معاشیات	ورنگل کی صنعت پارچہ بافی
۱۳	رام اوتار صاحب	"	حیدرآباد میں دیسی بنک کاری۔
۱۴	چترویدی نارائن داس	تاریخ	عہد معاونت اور اس کے اثرات
۱۵	بھارت چند کھنہ صاحب	"	سلطان فیروز شاہ تغلق
۱۶	ام، ہنمنت راؤ صاحب	"	ازمنہ وسطیٰ میں ہند کے ترک افغان دور کی عمرانی زندگی کے چند پہلو۔
۱۷	وینکٹ راؤ جادھو صاحب	"	مہاداجی سندھیا کے سیاسی منصوبے۔
۱۸	کمراج ایشور چند ودیاساگر صاحب	"	برطانوی ہند میں صوبہ جاتی حکومت کا ارتقاء۔
۱۹	کے وی بھوپال راؤ صاحب	"	ابوالحسن تاناشاہ کی حکومت اور اس میں مادنا کا حصہ۔
۲۰	رویندر پرشاد کھنہ صاحب	"	راجہ رام موہن رائے اور ان کے سیاسی تخیلات۔
۲۱	ہنمنت راؤ مانوی کر صاحب	"	سلطنت برطانیہ کا دستور ارتقاء۔
۲۲	گوپال راؤ اسگی کر صاحب	"	اصول وفاقیت اور اس کا عمل ہندوستان میں۔
۲۳	بنکٹ پرشاد صاحب	"	حیدرآباد دکن اور ہندو مسلم زندگی۔

ایم ایڈ

شمار	نام	عنوان مقالہ
۱	رادھا پرشاد صاحب	مدارس کی تعلیم سائنس میں مدرس کے ایضافی طریقے اور انفرادی طریقے کی اضافی تدریسی قدر معلوم کرنا۔
۲	کرشنا بائی صاحبہ	لڑکیوں کی ریاضی قابلیت۔
۳	سی سی سندرم صاحب	میکانی قابلیت اور اس کی پیمایش۔
۴	ڈی آر نرسھواں راؤ صاحب	ریاست حیدرآباد میں تحتانی تعلیم کی موجودہ حالت اور اسکا مستقبل۔
۵	ڈگمبر راؤ صاحب	مدارس ثانویہ کیلئے سائنس کی درسی آزمائشات کی ترتیب۔

ایل ایل ایم

شمار	نام	عنوان مقالہ
۱	ترمبک راؤ دیس مکھ صاحب	طلاق ہندو نظام قانون میں نیز اسلامی و عیسائی نظام ہائے قانون میں۔
۲	سورج نارائن سنگی صاحب	اصول دھرم شاستر کا طلاق عطائے دکن پر
۳	بھیم سین آچاری آسریت صاحب	وضع قوانین کا اثر دھرم شاستر پر۔
۴	ڈی لکشمن ریڈی صاحب	منڈل اور توانسن تویت کے نظریے ہندو اور دیگر نظام ہائے قانون میں۔
۵	ونایک راؤ انباڈے صاحب	رواج کی اہمیت ہندو اور دیگر نظام ہائے قانون میں۔

شمار	نام	عنوان مقالہ
۶	رامچندر راؤ ننداپورکر صاحب	ہندو بیوہ کا حق تبنیت بہ تعلق حصول و محرومی جائداد
۷	پرشوتم پلنٹ کر صاحب	نکاح اور اصول ہائے تصادم قوانین۔
۸	آننتا ریڈی صاحب	انصاف اور انتظامی قانون انگلستان میں۔
۹	اننت راؤ پھاٹک صاحب	ہندو خاندان مشترکہ اور رومی خاندان کا تقابل۔
۱۰	بہور لال جین صاحب	مقابلہ اصول تسلیم فیصلہ جات ملک غیر۔

ممکن ہے اور مقالہ نگار بھی ہوں مگر ہم کو جو مواد دستیاب ہوا ہے ان کی صراحت کردی گئی ہے۔

نثر نگار خواتین

جس طرح ہندو شاعرات کا تعارف کرایا گیا ہے اسی طرح ہندو نثر نگار خواتین کے کارنامے پیش کرنا ضروری ہے اگرچہ ایسی خواتین جنہوں نے اردو زبان میں مضامین لکھیں، افسانے قلمبند کئے اور کتابیں مرتب کی ہیں زیادہ نہیں ہیں۔ تاہم چند خواتین نے اردو نثر نگاری کی طرف توجہ کی اور قلم اٹھا کر اچھے نقش پیش کئے جن خواتین کے کارناموں سے ہم واقف ہیں انکا تعارف ذیل میں کرایا جاتا ہے:

امیسز برکت رائے آپ کا تذکرہ شاعرات کے ضمن میں کر دیا گیا ہے آپ نہ صرف شاعرہ ہیں بلکہ ادیب اور مقرر بھی ہیں آپکی اردو تقریر اور تحریر قابل ستائش ہوتی ہے۔ کئی مضمون قلمبند کئے ہیں اور بیسیوں جلسوں میں تقریر فرمائی ہے۔

بھگوت گیتا کا آپ نے اردو میں ترجمہ کیا ہے اور چھوٹی سائز کے (۱۵۳) صفحات پر اسکو شائع کیا ہے۔

مسز برکت رائے نہایت صاف سلیس اور عام فہم اردو لکھا کرتی ہیں۔ آپ کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

گیارھواں ادھیائے

وشو روپ درشن یوگ

ارجن نے کہا اے بھگوان مجھ پر مہربانی کر کے نہایت پر اسرار راز کو جو آپ نے بیان فرمایا تو اس سے میری بھول رفع ہو گئی ہے کیونکہ کائنات کی پیدائش اور خاتمہ کی کیفیت تفصیلی طور پر میں نے آپکی زبانی سنی

اور ساتھ ہی آپ کے اثرات کو بھی سنا۔ اے پرمیشور جیسا کہ آپ اپنے بارے میں کہتے ہیں ٹھیک ویسے ہی ہیں لیکن اے پرشوتم میں آپ کے لافانی جمال کو ظاہرا طور پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ میرے ذریعہ آپ کا جمال دیکھا جانا ممکن خیال کرتے ہوں تو اپنے لافانی جمال کو دکھائیے۔

ارجن کی استدعا پر شری کرشن نے کہا کہ اے ارجن میرے سینکڑوں ہزاروں مختلف قسم ورنگ وشکل والے عجیب جمالوں کو دیکھ ...... (صفحہ ۹۰)۔

مسز شانتی بائی آپ مسٹر سری کشن سنہا (جنکا تذکرہ اوراق گذشتہ میں ہو چکا ہے) کی شریک حیات ہیں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔اے میں کامیابی حاصل کی ہے وسیع مطالعہ کے علاوہ یورپ کی سیر کر کے معلومات میں اضافہ کیا ہے ادب اردو سے خاص دلچسپی ہے۔ "نیا روس" کے نام سے آپ نے ایک کتاب شائع فرمائی ہے، ترقی پسند مصنفین میں شامل ہیں مگر عریاں نگاری سے اجتناب کرتی ہیں، آپ کی ادبی دلچسپی کا ثبوت آپ کی اپنی کتاب کے انتساب کی جدت سے بھی مل سکتا ہے چنانچہ کہتی ہیں۔

اس جذبے کے نام جو غالب کے اس شعر میں پنہاں ہے:۔

"منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اودھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا"

"نیا روس" میں روسی حالات صاف آسان زبان میں قلمبند کئے گئے ہیں اس سے آپ کی انگریزی قابلیت کا بھی پتہ چلتا ہے کیونکہ جو حالات لکھے گئے ہیں وہ انگریزی سے ہی اخذ ہوئے ہیں۔

عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

"جنگ آزادی امریکہ کے بعد ایک نئے طرز کی حکومت جس کو وفاق کہتے ہیں وجود میں آگئی۔ وفاق کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جبکہ ملک بہت بڑا ہو اور مختلف قسم کے لوگ بستے ہوں، اور ہر شخص آزاد بننے کا خواہشمند ہو امریکہ میں وفاق انہی وجوہ کی بناء پر قائم کیا گیا۔ روس ایک بہت بڑا ملک ہے، جو کئی صوبوں میں منقسم ہے۔ یہاں مختلف النسل لوگ رہتے ہیں، اور ایک عرصہ دراز سے مقیم ہیں، ان حالات کی وجہ سے وفاق کا قائم کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ انقلاب ۱۹۳۱ء میں وفاق کا ڈھانچہ تیار کیا گیا۔"

"عورتوں کیلئے تعلیمی وسائل بھی اتنے ہی ہیں جتنے مردوں کیلئے انکی تعلیم لڑکوں کے ساتھ ہوتی ہے کسی قسم کی روک ٹوک نہیں۔ آرٹ، سائنس اور انجینری کے شعبہ جات میں انکی تعداد مساوی ہوتی ہے۔ شادی بیاہ اور طلاق میں انکو اتنی آزادی دی گئی ہے جو مردوں کو حاصل ہے۔ وہ بغیر کسی رسم و تحدید کے شادی کر لے سکتی ہیں، اور ناموافق حالات و قانونی وجوہ کی بناء پر طلاق دے سکتی ہیں۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۹۲۶ء میں شادیوں سے زیادہ طلاق ہوئے، ان سہولتوں کے باعث عصمت کا اتنا خیال نہیں ہے جو مشرق میں پایا جاتا ہے۔ سوسائٹی بھی عصمت پروری کو داخل آداب و اصول معاشرت نہیں سمجھتی یہ وہ منزل ہے جہاں جنسی جذبات کو بالکل کم اہمیت

دیگئی ہے۔ (نیا روس)۔

جمنا دیوی حیدرآباد کی رہنے والی ہیں رسالہ شہاب میں اکثر آپ کے اصلاحی اور معاشرتی مضمون شائع ہوئے ہیں، تفصیلی حالات کی اطلاع نہیں ہے، عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے۔ مضمون سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ منظر نگاری اور رُمان نویسی کا ملکہ رکھتی ہیں۔

"ماضی کی حسین یاد حال کا سب سے بہتر سرمایہ ہے، اے میری پیاری سکھی کئی سال بعد آج تمھارے پُتر نے میرے سامنے کتاب زندگی کے وہ اوراق الٹے جن پر ہمارے بچپن کی رنگین داستان لکھی ہوئی ہے۔ دیہات کی معصوم فضا میں گذرے ہوئے کھیل کود کے دن پھر تصور کی دنیا میں رقص کرنے لگے ....

اکثر اس صحن گلشن میں جب ٹھنڈی ہوائیں تصور کی دنیا کو جھولا جھلاتی ہیں جب معصوم امیدیں سورج کی زریں کرنوں کے ساتھ رقص کرتی ہیں اور ہر طرف مسرت کی بارش ہی بارش ہوتی ہے، مجھے یاد ماضی داتا نگر کی ان پہاڑوں کی سیر کراتی ہے جہاں ہمارا بچپن بےفکری کے نغمے گا گا کر جوانی میں تبدیل ہوا ہے۔ فطرت کی وہ خاموش مگر رنگین فضائیں جہاں قدرت کی نیرنگیاں صبح و شام اپنے کرشمے دکھاتی ہے"[1]۔

مس سرسوتی مس سرسوتی صاحبہ کلیہ اناث میں زیر تعلیم تھیں، رسالہ "ارم" میں انکے مضمون شائع ہوا کرتے تھے، تفصیلی معلومات

---

[1] شہاب بابتہ شہریور ۱۳۵۰ف۔

حاصل نہ ہوسکے۔ مضمون میں طنز اور مزاح کا رنگ اکثر غالب رہتا ہے
کالج کے ہوسٹل میں قیام کرتی تھیں۔

"ارے بھئی غضب خدا کا گرمی کے دن، باہر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور آپ ہیں کہ تمام دروازے بند کرکے دماغ سوزی کر رہی ہیں"۔

یہ کہتے ہوئے ہم نے کھڑکیاں کھولدیں۔ اپنی اپنی جگہ بیٹھی ہوئیں سب چیخ رہی تھیں، خدا کیلئے کھڑکیاں بند کردو۔ دیکھتی نہیں کہ باہر کیسی خوفناک تاریکی ہے۔ ڈر لگتا ہے۔ بند کردو کھڑکیاں، ہمیں ٹھنڈی ہوا کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی اندر آگیا تو کیا ہوگا۔ پھر تمام لڑکیاں ہراساں تھیں۔ خوف سے الفاظ تک صاف نہ نکلتے تھے۔

دیکھیں کون آجاتا ہے اندر سر نہ توڑ دینگے اس کا ان کرسیوں سے میں نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا[1]"

للیتا دیوی ڈاکٹر سنگھ صاحب کی دختر۔ نظام کالج سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی امریکن لائبریری میں ملازم ہیں، تعلیم کے زمانہ میں کالج کے میگزین میں اردو میں افسانے لکھا کرتی تھیں۔ موسیقی میں بھی خاصی مہارت حاصل ہے۔ اردو غزل گوئی میں بڑی اچھی مہارت حاصل ہے، سوشل جلسوں میں آپ کی موسیقی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔

وِدیا دیوی کرناٹک (رائچور) آپ کا وطن ہے، حیدرآباد جس وقت آئیں میٹرک میں کامیاب نہیں ہوئی تھیں ملازمت کے ساتھ تعلیم جاری

---

[1] رسالہ ارم حیدرآباد بابتہ ستمبر ۱۹۳۲ء۔ کالج کا ایک واقعہ۔

رکھی اور جامعہ عثمانیہ سے نہ صرف بی اے بلکہ ڈپ ایڈ میں کامیابی حاصل کرلی تاریخ آپ کا مضمون تھا اردو سے کنڑی ترجمہ اور کنڑی سے اردو ترجمہ کی اچھی مشق حاصل ہے۔

رتن بائی شعراء کے عنوان میں رتن بائی کا تذکرہ ہو چکا ہے، انکو نثر نگاری کا بھی شوق ہے، عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"۱۸۵۰ء کے بعد سے مرزا غالب نے اردو میں نثر لکھنی شروع کی۔ اس سے پہلے وہ فارسی میں خط و کتابت کیا کرتے تھے۔ جب انہیں "مہر نیم روز" کی تاریخ نویسی کے لئے کہا گیا تو انہوں نے اسکو اردو میں ترتیب دیا۔ اسکے علاوہ اس زمانہ میں وہ بوڑھے ہو گئے تھے چنانچہ اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب ۔۔۔ اب عناصر میں اعتدال کہاں

اردو معلیٰ میں حالی نے غالب کے رقعات کی اچھی تشریح کی ہے اس میں اونہوں نے بتایا ہے کہ عرفی، نظیری اور ظہوری نے اس میدان میں قلم اٹھائے ہیں۔ عرفی اور نظیری نے تو کوئی کمال حاصل نہ کیا البتہ ظہوری نے اپنے رقعات کے لئے خصوصاً نثر کے لئے بہت شہرت حاصل کر چکے ہیں۔"

کرانتی چندن نظام کالج سے استفادہ کیا، افسانہ نگاری سے دلچسپی ہے نظام ادب کے مضمون نگاروں میں شامل ہیں۔

"رتنا کے پتا رام بابو ایک مقامی اسکول میں مدرس تھے، ۱۹۳۱ء کا زمانہ اور تیس روپیہ ماہوار کی نوکری جیسے تیسے وہ اپنے دن گزار رہے تھے جو کچھ انکے یہاں باقی تھا انہوں نے

خاندان کے قرضہ کے عوض بھینٹ چڑھا دیا، گاؤں سے شہر کو
سدھارے اور انہیں جہاں اور کچھ نہ مل سکا پینتیس روپے کی
ملازمت مل سکی، رام بابو اس قابل بھی تھے کہ اس قلیل سی رقم
میں اپنی اور اپنے خاندان کی کفالت کر سکیں"۔

ڈاکٹر ویملا واگھرے

حیدر آباد کے مشہور ڈاکٹر واگھرے صاحب کی تیسری دختر، حیدر آباد میں تولد ہوئیں الہ آباد میں بھی قیام رہا جامعہ عثمانیہ سے ہندی ادب میں یم اے کی ڈگری لی اسکے بعد الہ آباد یونیورسٹی سے ڈاکٹریت (ڈی فل) کی ڈگری حاصل کی ہے۔ آپ کے مقالہ کا عنوان دکھنی شعرا اور تصوف تھا۔ اسی عنوان پر ہندی زبان میں مقالہ قلمبند کیا تھا۔

ڈاکٹر ویملا نے کچھ عرصہ تک حیدر آباد کے کالجوں میں ہندی کے لکچرار کی حیثیت سے بھی کام کیا ہے، ہندی کے ساتھ اردو سے بھی واقف ہیں دکھنی بورڈ کی سکریٹری کے فرائض انجام دیکر اپنی اردو، ہندی کے ذوق کا ثبوت پیش کیا وجہی کی قطب مشتری کو ناگری رسم الخط میں مرتب کر کے دکھنی بورڈ کیجانب سے اسکو شائع کیا ہے۔

شادی کے بعد ملازمت سے مستعفی ہو گئیں۔ آپ کی اردو کا نمونہ پیش ہے
رباعیات الہام" پر تنقید کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔

"زندگی میں خوشی اور غم کا جو اشتراک ہے اسی کو شاعر نے اپنی متعدد رباعیوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان میں کہیں کہیں ناامیدی بھی پھوٹ پڑتی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کی زندگی میں خوشی کے بہ نسبت غم کے زیادہ مواقع

آئے، ہیں، غم کی اس زیادتی کی وجہ سے ہی شاعر کے دل میں
زندگی سے بھاگنے کا ارادہ مستقل ہوتا رہا ہے، رباعیوں میں
زندگی سے بھاگنے کی اس خواہش کی تصویر کھینچی گئی ہے ...
.... انکے دل کی گہرائیوں کا ٹھیک ٹھیک مطالعہ
تب ہی کیا جا سکتا ہے جب انکے ادب کو پیش نظر رکھا جائے۔
ان رباعیوں کے مطالعہ کے بعد میں نے یہی سمجھا کہ ان کی سنک
سچ مچ سنک ہے، لیکن کسی لالچ کے باعث نہیں بلکہ صوفی منش
لوگوں کے اثر کے باعث ہے۔" (رسالہ سب رس مارچ ۱۹۵۷ء)۔

صفحات گزشتہ میں ڈیڑھ صدی کے نثر نگاروں کا تعارف کرایا گیا ہے
اس کے ملاحظہ سے واضح ہو سکتا ہے کہ اردو نثر کے مختلف فنون میں ہندو اصحاب
نے اپنے زور قلم کی جولانیاں پیش کی ہیں، افسانہ، تنقید، ڈرامہ، تاریخ، سوانح،
قانون، ریاضی، طب، فلسفہ و نفسیات، معاشیات وغیرہ فنون میں ہندو
اصحاب کے کارنامے نظر آتے ہیں، انکے اسلوب بیان کی خوبی اور طرز ادا کی
دلکشی صفائی اور سادگی ناقابل التفات نہیں ہے ادب کے اچھے نمونے
ہندو نثر نگاروں کے قلم کے رہین منت ہیں انہوں نے اردو زبان کی جو
خدمت انجام دی ہے وہ ہر آئینہ مستحق ستائش ہے۔ اگرچہ عبارت کا
نمونہ نہایت اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، جس سے نثر نگاری کا پوری
طرح جائزہ نہیں لیا جا سکتا۔ مگر اس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ
نثر نگاروں نے کن کن فنون کی جانب توجہ کی اور ان کا اسلوب بیان
کیسا ہے۔

نمونہ میں اختصار اس لئے ملحوظ رکھا گیا کہ ضخیم کتاب موجودہ دور میں ناقابل التفات سمجھی جاتی ہے۔ اس مجموعہ سے اس امر کا تو بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ دکن میں بھی ہندو اصحاب اردو کے اچھے صاحب قلم ہیں اور انہوں نے اردو کی خدمت کی ہے۔

(۳)

اخبارات و رسائل اور انکے ایڈیٹر

اردو زبان کی خدمت شعرا اور نثر نگاروں کے ساتھ اخبار اور رسائل کے ہندو ایڈیٹروں نے بھی کی ہے۔ انکا تذکرہ نہ کرنا ایک بہت بڑی فرو گذاشت ہو گی۔ اسلئے یہاں ان ہندو حضرات کا تعارف کرایا جاتا ہے جنہوں نے اردو اخبار یا رسالہ کی ایڈیٹر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی اور اپنے اخبار اور رسالہ کے ذریعہ اردو زبان کی خدمت کی ہے یا کر رہے ہیں۔

یہ امر خصوصیت سے قابل تذکرہ ہے کہ حیدر آباد میں اردو اخبار کی بنیاد پہلے پہل ایک ہندو اہلِ قلم نے رکھی اور اسکے بعد دوسرے اصحاب اس میدان میں آئے ہیں، نہ صرف پیش قدمی کا سہرا ایک ہندو اہل قلم کے سر ہے بلکہ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حیدر آباد کا طویل العمر اخبار جو آجتک برابر شائع ہو رہا ہے یعنی "مشیر دکن" یہ بھی ایک ہندو ایڈیٹر کا اجرا کردہ ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو اخباروں نے ملک کی جو بیش بہا خدمت انجام دی ہے ان میں ہندو ایڈیٹروں کا کافی حصہ ہے، ایک طرف انھوں نے اردو کی خدمت کی اور دوسری طرف ملک کو بیدار کرنے کا بڑا کام کیا ہے۔ خصوصیت سے اخبار مشیر دکن، اور اخبار رعیت کے خدمات تاریخ دکن سے مٹ نہیں سکتے۔ اس موقع پر یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ ان دونوں اخباروں کو ہندو اہلِ قلم

کے ساتھ مسلمان اہل قلم کا پورا تعاون حاصل تھا، چنانچہ مشیر دکن کے ساتھ مولوی محبیب احمد تمنائی، مولوی سردار علی، مولوی عبدالقادر مرحوم رجسٹرار، کے ناموں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اور "رعیت" کے ساتھ فضل الرحمٰن، عطاء الرحمٰن، غلام پنجتن، اور بشیر احمد صاحب طاہر کے نام نظر آتے ہیں۔ اخباروں کی تفصیل کے پہلے اولاً ہم انکی فہرست پیش کرتے ہیں۔

شمار	نام اخبار	ایڈیٹر	نوعیت	سنہ اجرائی
۱	آصف الاخبار	نارائن راؤ	ہفتہ وار	سنہ ۱۸۷۸ء
۲	دکن پنچ	کشن راؤ	"	سنہ ۱۸۸۶ء
۳	دبدبۂ آصفی	رتن ناتھ سرشار	ماہوار	سنہ ۱۸۹۷ء
۴	مشیر دکن	کشن راؤ	روزانہ	سنہ ۱۸۹۹ء
۵	محبوب گزٹ	پیارے لال	ہفتہ وار	سنہ ۱۹۰۵ء
۶	شاہد سخن	گوبند پرشاد	ماہوار	سنہ ۱۹۱۲ء
۷	ادیب اطفال	رگھوناتھ راؤ درد	"	سنہ ۱۹۱۲ء
۸	دکن لا رپورٹ	گراراجہ صاحب وینکٹ پرشاد راؤ صاحب	"	سنہ ۱۹۱۵ء
۹	نظائر	ترلوکی ناتھ صاحب	"	سنہ ۱۹۱۷ء
۱۰	دوست	دشنو مادھو راؤ "	"	سنہ ۱۹۲۰ء
۱۱	سائنس کی صدا	بھوانی پرشاد "	"	سنہ ۱۹۲۵ء
۱۲	آئین دکن	انبا داس راؤ "	"	سنہ ۱۹۲۶ء
۱۳	رعیت	یم نرسنگ راؤ "	ہفتہ وار	سنہ ۱۹۲۷ء
۱۴	دکن پنچ	جگناتھ پرشاد "	"	سنہ ۱۹۲۹ء
۱۵	رعیت	یم نرسنگ راؤ "	"	سنہ ۱۹۳۴ء

سنہ اجرائی	نوعیت	ایڈیٹر	نام اخبار	شمار
۱۹۴۷ء	ہفتہ وار	بی ایس راؤ صاحب	رہنما	۱۶
۱۹۴۷ء	روزانہ	لچھما ریڈی "	محب وطن	۱۷
۱۹۴۷ء	پندرہ روزہ	جانکی پرشاد "	پیام امن	۱۸
؟	ہفتہ وار	ٹھاکر امراؤ سنگھ "	آزاد	۱۹
؟	"	واس دیو شاستری "	امان	۲۰
۱۹۴۶ء	ماہوار	برج لال "	رہبر تعلیم	۲۱
۱۹۴۸ء	روزانہ	جے ین شرما "	نئی زندگی	۲۲
۱۹۴۷ء	"	شاکر "	ملاپ	۲۳

یہ ہیں وہ اخبار اور رسالے جو ہندو اصحاب قلم کے رہین منت ہیں ۔

ا۔ بعض اخباروں اور انکے ایڈیٹروں کے متعلق مختصر صراحت کیجاتی ہے ۔

(۱) **نارائن راؤ صاحب**، حیدرآباد کی اردو اخباری دنیا میں نارائن راؤ صاحب کا نام اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ اونہوں نے پہلے پہل حیدرآباد سے اردو اخبار شائع کیا تھا اس اخبار کا نام "آصف الاخبار" تھا جو سلطنت آصفیہ کے لحاظ سے رکھا گیا تھا افسوس ہے اس اخبار کے پرچے ہم کو دستیاب نہیں ہوئے اسلئے تفصیلی طور پر کوئی صراحت نہیں کیجا سکی، صرف یہ معلوم ہے کہ یہ ہفتہ وار اخبار تھا اور ۱۸۶۸ء میں حیدرآباد سے شائع ہوتا تھا۔

(۲) **مشیر دکن**، اسکے ایڈیٹر کشن راؤ صاحب تھے، اولاً دکن پنچ کے نام سے ۱۸۸۶ء ہفتہ وار اخبار شائع فرمایا اسکے بعد اسکو مشیر دکن کے نام سے روزانہ کر دیا گیا (۱۸۹۲ء) سے اسکی اشاعت ہو رہی ہے، حیدرآباد کے موجودہ تمام اخباروں اور رسالوں میں اسی کو تقدیم حاصل ہے، کشن راؤ صاحب نے

اپنی سلامت روی کے باعث ہر زمانہ میں اپنے اخبار کو مقبول کیا تھا ایک زمانہ تھا کہ بجز مشیر دکن کے اور کوئی اخبار حیدرآباد سے شائع نہیں ہوتا تھا، عرصہ دراز تک اسکے صرف چار صفحے ہوتے تھے، کشن راؤ صاحب نے بعض ممتاز اہل قلم کو اپنی امداد کیلئے انتخاب کرلیا تھا، مولوی مجیب احمد صاحب تمنائی، اور مولوی سردار علی صاحب عرصہ تک انکے ساتھ کام کرتے رہے۔ اس کے بعد ماداپتی ہنمنت راؤ صاحب روح رواں بن گئے تھے۔ اسکے علاوہ اس میں ملک کے دیگر اہل قلم کے مضامین بھی حیدرآباد کے نظم ونسق اور تعلیم اور سیاست وغیرہ کے متعلق شائع ہوتے تھے، کئی سال تک اس اخبار کی حیثیت نیم سرکاری اخبار کی رہی، اسکے سیکڑوں پرچے سرکاری دفاتر میں خریدے جاتے تھے۔ کشن راؤ صاحب نے اپنے انتقال تک اپنے اخبار کی متانت وضع داری و معتدل پالیسی کو قائم رکھا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں آپ کا انتقال ہوا، کشن راؤ صاحب کے مرنے کے بعد انکے فرزند واس دیو راؤ صاحب اسکے ایڈیٹر ہوئے اور آجتک یہ اخبار برابر شائع ہورہا ہے۔ واسدیو راؤ صاحب نے بھی اپنے اخبار کی سابقہ معتدل پالیسی، وضع داری اور سلامت روی کو قائم رکھا ہے۔

(۳) محبوب گزٹ کو منشی پیارے لال صاحب نے ۱۳۲۳ھ میں ایک ہفتہ وار اخبار کی صورت میں شائع کرنے لگے کچھ عرصہ کے بعد یہ بند ہوگیا۔

(۴) دبدبۂ آصفی کو پنڈت رتن لال سرشار ایڈیٹ کرتے تھے مہاراجہ کشن پرشاد کیجانب سے ۱۳۱۵ھ میں ماہوار شائع ہونے لگا تھا، یہ رسالہ بلند معیار کا حامل تھا کیونکہ سرشار کی ایڈیٹری اور مہاراجہ کی سرپرستی کا ہونا کافی ضمانت تھا پنڈت صاحب کی حیات تک یہ رسالہ شائع ہوتا رہا اور اردو زبان کی خدمت میں برابر حصہ لیا۔

(۵) **شاہد سخن** کے نام سے گوبند پرشاد صاحب نے ۱۳۳۱ھ سے ایک ماہوار علمی و ادبی رسالہ شائع کرنے لگے تھے۔ اندرون دبیر پورہ سے یہ نکلتا تھا گوبند پرشاد صاحب کی علمی قابلیت نے رسالہ کو چمکا دیا تھا۔ مگر ناموافق حالات کے باعث کچھ دنوں کے بعد یہ بند ہو گیا۔

(۶) **دکن لا رپورٹ** کے ایڈیٹروں میں پنڈت گر راؤ صاحب بابو گیا پرشاد صاحب پنڈت کیشو راؤ صاحب، پنڈت انبا داس راؤ صاحب، پنڈت ونایک راؤ صاحب وغیرہ جیسے قابل وکلاء کے نام نظر آتے ہیں، یہ رسالہ ۱۹۱۱ء سے شائع ہونے لگا، اور اولاً محمد اصغر (اصغر یار جنگ) اس رسالہ کے اجرائی کے بانی ہیں انکے بعد صدر الذکر اصحاب سے اسکی ادارت متعلق رہی۔ اس میں عدالت ادر مال کے فیصلے شائع ہوتے تھے۔ پولیس ایکشن کے بعد پرشوتم راؤ صاحب وکیل ایڈیٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

(۷) "**رعیت**" کے ایڈیٹر نرسنگ راؤ صاحب مدرسہ دار العلوم کے تعلیم یافتہ ہیں آپ کا تذکرہ ادیبوں کے ضمن میں صراحت سے کر دیا گیا ہے۔ پہلی مرتبہ رعیت ہفتہ واری اخبار کی حیثیت سے ۱۳۳۷ف سے شائع ہونے لگا مگر ۱۳۳۹ف میں بعض مضامین کی وجہ سے جو ریلوے کی خریدی سے متعلق تھے یہ اخبار بند کر دیا گیا تھا مگر پھر ۱۳۴۳ف سے شائع ہونے لگا۔ کچھ عرصہ تک روزانہ اخبار کی صورت بھی رہی پھر ہفتہ وار ہو گیا تھا، مگر اب بند کر دیا ہے۔ نرسنگ راؤ صاحب اردو، فارسی کی بڑی اچھی قابلیت رکھتے ہیں، حیدر آباد کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ سے انکے مراسم ہمیشہ سے اچھے رہے، شروع سے یہ اخبار نہایت جانفشانی اور سلیقہ سے مرتب کیا جاتا رہا ہے۔ نوجوان طبقہ کو بیدار کرنے اور ان میں کام کرنے کی امنگ پیدا کرنے میں اخبار رعیت کا بڑا حصہ ہے

یم نرسنگ راؤ صاحب نے اخبار "رعیت" اجرا کر کے ملک پر جو احسان کیا تھا اسکی ستائیش نہ کرنا ناقابل معافی جرم ہوگا، نرسنگ راؤ صاحب کے ساتھ حیدر آباد کے کئی اصحاب قلم متحد ہو گئے تھے جن میں سے بعض یہ ہیں مسٹر عطاء الرحمن مسٹر فضل الرحمن، مسٹر غلام پنجتن، بشیر احمد طاہر، بی یس راؤ، سری کشن صاحب

اگر حیدر آباد کے اخبار کو اسکے کام اور معیار کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے تو اخبار رعیت کا نام پہلی صف میں آئیگا۔

(۸) سائیں کی صدا کو بھوانی پرشاد صاحب نے ۱۹۲۵ء میں ایک ماہوار رسالہ کی صورت میں شائع کیا تھا۔ اس میں سری ست گرو اپاسن بابا کے نصائح اور اقوال کے علاوہ تصوف سے متعلق مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ بھوانی پرشاد صاحب کو تصوف سے خاص لگاؤ تھا اسلئے یہ رسالہ کامیاب رہا۔

(۹) آئین دکن پی انبا داس راؤ صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا تھا اولاً فدا حسین صاحب اس رسالہ کے ایڈیٹر تھے ۱۳۰۲ف میں اونہوں نے اسکو شائع کیا تھا مگر چند سال کے بعد بند ہو گیا تھا، دوبارہ اسکی اجرائی ۱۳۳۶ف میں ہوئی اور انبا داس راؤ صاحب اسکے اڈیٹر تھے۔

(۱۰) "نظائر" کو پنڈت ترلوکی ناتھ بھلے ۱۳۲۷ف میں ایک ماہوار رسالہ کی صورت میں شائع کرتے تھے اس میں پریوی کونسل، اور برطانوی ہند کے جملہ عدالتہائے عالیہ کی نظائر عام فہم اردو میں درج کی جاتی تھیں، کئی سال تک یہ رسالہ شائع ہوتا رہا۔ اور یہاں کے جج و وکلاء کو انگریزی زبان نہیں آتی تھی اس سے بڑی مدد ملتی تھی وہ اپنی بحث میں اس رسالہ کو ثبوت میں پیش کرتے تھے انصاف رسانی میں اس رسالہ نے بہت بڑی مدد پہنچائی۔

(۱۱) دکن پنچ حکیم جگناتھ پرشاد صاحب ۱۹۲۹ء میں ہفتہ وار اخبار کی

صورت میں شائع کرنے لگے جس میں ظریفانہ مضامین ہوتے تھے مگر کچھ عرصہ کے بعد یہ اخبار بند ہوگیا۔

(۱۲) ادیب الاطفال رگھوناتھ صاحب وردہ جنکا تذکرہ صفحات ماقبل میں ہوچکا ہے ۱۹۱۲ء میں ایک ماہوار رسالہ بچوں کیلئے ادیب الاطفال کے نام سے جاری کیا تھا جو چند ماہ تک شائع ہوتا رہا۔

(۱۳) "دوست" پنڈت وشنو مادھو راؤ صاحب نے ۱۹۲۰ء میں ایک قانونی ماہوار رسالہ دوست کے نام سے جاری کیا تھا۔

(۱۴) "محب وطن" کے نام سے لچھا ریڈی صاحب جو عدالت عالیہ کے رکن تھے، وظیفہ حاصل کرنیکے بعد ایک اردو روزانہ اخبار جاری فرمایا تھا. جو چند سال تک شائع ہوتا رہا۔

(۱۵) پیام امن جانکی پرشاد صاحب جنکا تذکرہ صفحات گزشتہ میں ہوچکا ہے ۱۹۴۷ء میں "پیام امن" کے نام سے ایک پرچہ شائع کرتے تھے جو اسم با مسمیٰ تھا اسکے مضامین کے ذریعے ملک میں امن قائم کرنے اور آپس میں اتفاق اور اتحاد سے رہنے کی تبلیغ کی جاتی تھی جو بڑی حد تک کامیاب رہی۔

(۱۶) آزاد ٹھاکر امراؤ سنگھ صاحب نے آزاد کے نام سے ایک اخبار جو روزانہ تھا شائع کیا تھا۔

(۱۷) رہنما، بی یس راؤ صاحب اسکے ایڈیٹر تھے جو پہلے اخبار رعیت کے جائنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی تھی۔ ہفتہ وار اخبار تھا اور بہت جلد اس اخبار نے حیدر آباد کے اردو اخباروں میں اہمیت حاصل کرلی تھی

(۱۸) امان، واسدیو شاستری صاحب نے ایک ہفتہ وار اخبار "امان" کے نام سے جاری کیا تھا۔

(۱۹) رہبر تعلیم برج لال صاحب جنکا تذکرہ صفحات گزشتہ میں ہوچکا ہے ایک ماہوار رسالہ جو علمی اور ادبی تھا "رہبر تعلیم" کے نام سے جاری فرمایا تھا۔

(۲۰) نئی زندگی، جے ین شرما صاحب نئی زندگی کے نام سے ایک روزانہ اخبار ۱۹۴۳ء میں شائع کرنے لگے۔

(۲۱) ملاپ، پولیس ایکشن کے بعد لالہ گوری شنکر ساگر کی اڈیٹری میں "ملاپ" کے نام سے ایک روزانہ اخبار شائع ہونے لگا۔ اب اس کے ایڈیٹر پورن چند صاحب شاکر ہیں، موجودہ اردو اخباروں میں جن اخباروں کو معیاری کہا جاسکتا ہے اس میں ملاپ بھی شامل ہے۔ ہر سال اس اخبار کے کئی خاص نمبر شائع ہوتے ہیں جن میں حیدرآباد اور باہر کے مشاہیر اہل قلم کے مضامین ہوتے ہیں، شاکر صاحب کے حسن اخلاق اور قلم کی جولانی سے اس اخبار کو کافی مقبولیت حاصل ہورہی ہے۔

(۴) وکلا اور ایڈوکیٹ

قلمرو آصفی کی عدالتوں میں ۱۸۷۵ء سے اردو کا آغاز ہوا فارسی کی جگہ اردو رائج ہونے لگی اور بالآخر ۱۸۸۳ء میں پوری طرح تمام دفاتر مال و عدالت وغیرہ اردو میں کر دئیے گئے یعنی حکومت آصفیہ کی سرکاری زبان اردو قرار دیدی گئی اسکی وجہ سے نہ صرف تمام سرکاری دفاتر میں اردو میں کاروبار ہونے لگا بلکہ مدارس میں بھی اردو میں تعلیم ہونے لگی۔ قانونی کتابیں اردو میں مرتب ہوتی گئیں، وکالت کی تعلیم کیلئے خاص انتظام ہوا لا کلاس قائم ہو کر وکالت کا امتحان ہونے لگا، اس کے تین درجے مقرر ہوئے، یعنی اول، دوم اور سوم ان تینوں درجوں میں ہندو اصحاب شریک ہو کر کامیابی حاصل کرنے لگے۔ شمالی ہند سے بھی کئی وہ اصحاب جنکی مادری زبان اردو تھی حیدرآباد آکر یہاں کی عدالتوں میں پیروی کرنے لگے، اس طرح نہ صرف حیدرآبادی وکلا و بلکہ شمالی ہند کے وکلاء کے باعث اردو کو کافی ترقی ہوئی ہے۔ عدالتوں میں بیانات اردو میں لکھے جاتے جرح اردو میں ہوتی، درخواستیں اردو میں دئے جاتیں اور فیصلے اردو میں ہوتے تھے، اس طرح عدالتوں میں خواہ وہ سررشتہ عدلیہ کی عدالت ہو یا سررشتہ مال کی ہر جگہ اردو زبان کو ترقی کرنے کا موقع ملا۔ ماہوار قانونی رسالے شائع ہونے لگے جن میں فیصلے اور قانونی نکات اور

قانونی نظائر درج ہوتے، یہ تمام وہ وجوہات تھے جس کے باعث ہندو اصحاب اردو میں مہارت پیدا کرتے رہے۔ حاکم بننے کے لئے اور وکیل بننے کے لئے، اردو کی ضرورت تھی۔ اسلئے وہ تمام اصحاب جنکی مادری زبان تلنگی، مرہٹی اور کنڑی ہوتی تھی وہ بھی اردو میں اچھی مہارت حاصل کرتے رہے۔ اس موقع پر یہ بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، جس طرح شمالی ہند کے ہندو وکلاء حیدرآباد آکر یہاں کی عدالتوں میں پیروی کرتے تھے اسی طرح کئی ہندو اصحاب مدراس بنگلور پونہ سے آکر یہاں اردو میں مہارت حاصل کرلی اور پیروی کرنے لگے۔

جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے کہ ۱۸۸۳ء میں حیدرآباد کی سرکاری زبان اردو قرار پائی اس طرح تقریباً ستر سال کے عرصہ میں جن ہندو وکلا نے نام و نمود حاصل کیا انکی فہرست بھی خاصی طویل ہوتی ہے، اس لئے ہم صرف چند ایسے اصحاب کا تذکرہ کرتے ہیں جنکا تذکرہ نہ کرنا بڑی فروگذاشت ہوگی، صفحات گذشتہ میں کئی ایسے وکلاء کا تذکرہ ہو چکا ہے جنہوں نے اردو کی ترقی میں حصہ لیا ہے، مثلاً بابو گیا پرشاد صاحب، پنڈت کیشو راؤ صاحب رائے بیجناتھ صاحب، رام کرشن راؤ صاحب، رام چندر نائک صاحب، کے وی رنگا ریڈی صاحب، کاشی ناتھ راؤ صاحب، سری کشن صاحب یم نرسنگ راؤ صاحب، یکبوٹے صاحب، جے وی نرسنگ راؤ صاحب وغیرہ انکے علاوہ کئی اور اصحاب ہیں جو اولاً وکالت میں بھی نام پیدا کیا اور پھر سرکاری عہدہ دار بنکر فیصلہ کرتے لگے، مثلاً راجہ بہادر بشیشور ناتھ صاحب، پنڈت سری پت راؤ صاحب، گرراؤ صاحب، لچھما ریڈی صاحب، منوہر پرشاد صاحب ونایک راؤ صاحب، جگ موہن ریڈی صاحب وغیرہ۔ شمالی ہند کے قطع نظر جو اصحاب جنوبی ہند سے آکر یہاں بود و باش کرلی اور اردو میں مہارت پیدا کی

ان میں سے خصوصیت سے راؤ بہادر کشٹماچاری صاحب، دیوان بہادر آرمدو اینگار صاحب، کلیان رائے اثر صاحب، نرسہواں راؤ اینگار صاحب وغیرہ قابل تذکرہ ہیں۔

جیسا کہ قبل ازیں تذکرہ کیا گیا ہے قلمرو آصفی کی عدالتوں میں ستر سال سے اردو کا رواج رہا اس طویل مدت میں حیدرآباد اور اضلاع میں سیکڑوں وکلاء نے نام و نمود حاصل کیا۔ اضلاع کو نظر انداز کر کے صرف شہر حیدرآباد کے وکلاء کو منتخب کیا جائے تو ان کی طویل فہرست ہوگی۔ حیدرآباد کے چند وکلاء یہ ہیں پنڈت راماچاری اول، پنڈت سری نواس چاری، رائے منور بہادر، باپو راؤ صاحب، انبا داس راؤ صاحب، بالا پرشاد صاحب، گل بہادر صاحب، سری کھنڈے صاحب، مانک پرشاد صاحب، تریدی صاحب، گنپت لال صاحب، ڈگمبر پرشاد صاحب، گوپال راؤ صاحب، لکشمی نرسیا صاحب، ہری نارائن صاحب، رام چندر راؤ صاحب، سری نواس راؤ شرما، منور سنگھ صاحب، سندر راج صاحب، رام ریڈی صاحب وغیرہ۔

جامعہ عثمانیہ سے جن اصحاب نے یل یل بی، اور یل یل یم کی ڈگریاں لی ہیں، ان میں سے بعض کا تذکرہ قبل ازیں ہو چکا ہے مثلاً گوپال راؤ ایکبوٹے، رودی نرسنگ راؤ صاحب، انکے علاوہ کئی اور اصحاب قابل تذکرہ ہیں مثلاً کرشنا چاری جوشی، عرب گنپت راؤ صاحب، رائے ہند کشور ماتھر صاحب وغیرہ۔

جن اصحاب نے یورپ سے قانونی ڈگریاں حاصل کیں اور حیدرآباد میں اولاً وکالت کے زمرہ میں شامل ہوئے ایسے کئی اصحاب ہیں، مثلاً رامچندر نایک صاحب، لچھما ریڈی صاحب، جگ موہن ریڈی صاحب،

ونایک راؤ صاحب وغیرہ۔

نایک صاحب کا تذکرہ صفحات ماقبل میں ہو چکا ہے۔ اسی طرح لچھما ریڈی صاحب کے اخبار کا ذکر بھی آچکا ہے، ونایک راؤ صاحب جو پنڈت کیشو راؤ صاحب کے فرزند ہیں یورپ سے کئی ڈگریاں لاتے کے بعد وکالت بھی کی اور رسالہ دکن لا رپوٹ کے ایڈیٹر بھی رہے۔ جو حیدرآباد کا مشہور قانونی رسالہ تھا۔ عوامی حکومت کے زمانہ میں ونایک راؤ صاحب کو منسٹروں میں شامل کیا گیا۔ اور آپ نے بلا تعصب انصاف کے ساتھ اپنے دور منسٹری کو ختم کیا۔

حکومت آصفیہ میں جب لائق علی وزارت قائم ہوئی تو عوام کیجانب سے جن وزا کو لیا گیا تھا ان میں راما چاری صاحب وکیل شامل تھے اسکے بعد جب پولیس ایکشن کے بعد حکومت حیدرآباد قائم ہوئی تو اس کے چیف منسٹر اور کئی منسٹر وکلار کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان میں سے بعض نے خصوصیت سے اردو کو ترقی دی مثلاً بی رام کشن راؤ صاحب، کے وی رنگا ریڈی صاحب اور گوپال راؤ صاحب ایکبوٹے وغیرہ۔

اس تفصیل کے بعد میں چند وکلاء کا مختصر حال قلمبند کرتا ہوں جن کا تذکرہ قبل ازیں نہیں ہوا، اور جو خصوصیت سے قابل تذکرہ معلوم ہوتے ہیں۔

(۱) مدنور سرینواس راؤ صاحب — تلنگانہ وطن، حیدرآباد کے مشاہیر ایڈوکیٹس میں شمار ہوتا ہے۔ اردو سے بڑا شغف ہے، عدالتوں میں اردو زبان باقی رکھنے کے لئے آپ نے جو جد و جہد کی تھی وہ فراموش نہیں کیجا سکتی۔ اخبار "رعیت" میں آپ کے مضامین اکثر شائع ہوتے تھے، ایجوکیشنل کانفرنس میں بھی حصہ لیتے رہے۔

آپ نے حکومت حیدرآباد کی عدالتوں میں اردو کو باقی رکھنے کیلئے جو کوششیں کی ہیں وہ ہمدردان اردو سے خراج تحسین حاصل کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ باوجود آپ کی مادری زبان تلنگی ہونیکے آپ کو جو شغف اردو سے ہے وہ ایک نمونہ اور نظیر ہے۔

(۳) کرشناچاری جوشی

جوشی صاحب کا وطن کرناٹک رائچور ہے، ۱۹۰۰ء میں تولد ہوئے گلبرگہ ہائی اسکول کے بعد جامعہ عثمانیہ میں شریک ہوئے اور بی اے ایل ایل۔ بی کی ڈگریاں حاصل کیں' آپ کا مضمون فلسفہ رہا۔ ختم تعلیم کے بعد وکالت کا پیشہ اختیار کیا' خصوصیت سے "سررشتہ عطیات" دمال میں مہارت پیدا کی اور جلد سربرآوردہ وکیلوں میں شمار ہونے لگے' ساتھ ساتھ سیاست میں بھی دلچسپی لیتے رہے۔ کرناٹک کانفرنس' کرناٹک سنگ کے سکریٹری رہے' سلطان بازار میں لڑکیوں کا اسکول قائم کیا۔ جوشی صاحب ایک دردمند دل اور خلوص کے حامل ہیں وہ انسانیت کے طرفدار ہیں کسی فریق کی زیادتی پسند نہیں کرتے' پولیس ایکشن کے بعد جو تباہی حیدرآباد کے بعض اضلاع میں ہوئی اسکے انسداد کے جانب آپ نے توجہ کی اور پورے خلوص انہماک کیساتھ بازآبادکاری کی طرف مشغول ہوئے بیواؤں اور یتیموں کی نگہداشت میں اپنی پوری کوشش صرف کی' ملا عبدالباسط صاحب کے ساتھ ملکر ان دونوں اصحاب نے جو جدوجہد اور کوشش کی ہے اس کا اعتراف اضلاع بیدر عثمان آباد وغیرہ کے لوگوں کو پوری طرح ہے۔ جوشی صاحب بلا مقابلہ باتفاق تعلقہ یادگیر کیجانب سے مرکزی لوک سبھا کے رکن ہوئے تھے۔ جوشی صاحب کو فلسفہ کے ساتھ مذہب سے پورا شغف ہے' اُنکے

ساتھ وہ متعصب نہیں ہیں بلکہ رواداری انسانیت کی بھلائی ان کے فطرت کے لاینفک جز ہیں۔ تصنیف و تالیف سے دلچسپی ہے۔ انگریزی، کنڑی میں سیاست اور فلسفہ پر کئی ایک کتابیں لکھی ہیں جنکو کنڑی ادب میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے، اردو میں اگرچہ کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی ہے مگر مضامین قلمبند کئے ہیں۔

(۳) ایم رامچندر راؤ ضلع محبوب نگر کے ایک معزز وطندار خاندان سے متعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے خاندان میں صدیوں سے معاش جاری ہے، سنہ ۱۹۰۱ء میں تولد ہوئے اولاً گھر پر تلنگی، اردو، فارسی کی تعلیم پائی پھر مدرسہ دارالعلوم میں شریک ہوئے اور منشی میں کامیابی حاصل کی، جامعہ عثمانیہ کے تحت انگریزی میٹرک کی تعلیم ختم کی، اسکے بعد وکالت کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کی، سررشتہ مالگزاری کے خصوصی وکلاء میں آپ کا شمار ہے۔

اولاً کانگریس کے سرگرم رکن رہے، مگر پولیس ایکشن کے بعد جب بدعنوانیوں کو دیکھا تو اولاً انکو موقوف کرنے کی کوشش کی، جب ناامید ہو گئے تو کانگریس سے علیحدگی اختیار کر لی، اور کسان مزدور پارٹی میں شریک ہو گئے اور اس جماعت کے نائب رہے۔

رامچندر راؤ صاحب ایک مخلص اور دردمند دل کے مالک رواداری کے مؤید ہیں لیڈروں کی کج روی اور غلط کاریوں کو الم نشر کرنا اور صحیح راستہ پر انکو گامزن کرانا آپ کا مقصد ہے۔ اردو تلنگی میں آپ نے بیسیوں مضامین، مقالے قلمبند کئے ہیں، آپ کے لئے یہ دشوار نہیں تھا کہ کانگریسی رہنماؤں کا ساتھ دیکر وزارت کے عہدہ پر فائز ہوتے مگر چونکہ آپ کے اصول

کانگریس کی خامیوں کو اجاگر کرنا ہے اسلیئے کسان مزدور پارٹی اور ہندوستان سوشیلسٹ پارٹی کا انضمام ہوا تو پرجا سوشلسٹ پارٹی کی تشکیل ہوئی اور اس پارٹی سے رامچندر راؤ صاحب کو ملک کی بھلائی کی بہت کچھ توقعات وابستہ تھے۔ گر جب مایوسی ہوئی تو آپ نے اپنا تعلق منقطع کر لیا، اور اب آزاد رہکر کسی پارٹی میں شریک نہ رہکر ملک و قوم کی خدمت میں مصروف ہیں، آپ نے حیدرآباد کے تقسیم نہ ہونے کے متعلق پوری کوشش اور جدوجہد کی تھی اور اس مہم کے جو سرگرم کارکن بنے ان میں سے ایک آپ بھی تھے۔

آپ کے بیسیوں مضامین اور مقالے اردو کے معیاری اخباروں میں شائع ہوئے ہیں عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

"سردار پٹیل کی مداخلت سے دو متوازی کانگریس کی تنظیم بوخاست ہوگئی اور ایک کانگریس بن گئی، سوامی جی بعد شری بی رام کشن راؤ کے متفقہ صدر شری ڈی جی بندو بن گئے، اتحاد و اتفاق دکھنے لگا۔ سردار پٹیل کو یہ اتحاد حقیقی معلوم ہوا، وہ یہ معلوم نہ کرسکے کہ یہ اتحاد و اتفاق محض دکھاوے کا ہے۔ وہ اس واقعہ سے واقف نہ ہوسکے کہ اب تک اگر شری بی رام کشن راؤ اور سوامی جی کی دو جماعتوں کی پھوٹ تھی اب اور کئی گروپ بن گئے اس لاعلمی کے باعث یہاں کے کانگریس کے کچھ نمائندوں کو وزارتوں میں لینے راضی ہوگئے۔ چار وزرا کو لینے کا طے ہوا۔ ورکنگ کمیٹی نے اپنے صدر شری بندو کو اختیار دیا کہ وہ خود چار نمائندوں کو نامزد کریں۔" (از کانگریس کا زوال)۔

(۴) راگھویندر راؤ شرما مہاراشٹر کے متوطن ہیں اور حیدرآباد میں وکالت کا امتحان پاس کرکے وکالت شروع کی۔ اولاً ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ شریک رہے اور اسکے اجلاسوں میں تقریریں کرتے رہے چونکہ آپ کی تقریروں میں حکومت کے عہدہ داروں پرنکتہ چینی ہوتی تھی اور مرہٹی کتابوں میں حکومت سرکار عالی پر سخت اعتراض ہوتا تھا اور سیاسی جلسوں میں آپ کا بڑا حصہ تھا اسلئے حکومت آصفیہ نے شرما صاحب کو حیدرآباد سے نکال دیا تھا۔ پولیس ایکشن کے بعد پھر آپ حیدرآباد آگئے، حیدرآباد کی تقسیم کے بڑے حامیوں میں رہے ہیں۔

(۵) کونڈا لکشمن صاحب کونڈا لکشمن صاحب ایڈوکیٹ کا تذکرہ بھی ضروری ہے آپ آندھرا دیش کی لیجس لیٹو اسمبلی کے ممبر ہیں، اور پرجوش کانگریسی لیڈروں میں شمار رہے، حیدرآباد کے تقسیم کرنے کی جدوجہد میں آپکا خاص حصہ رہا ہے، اخبار ملاپ میں آپ کے اکثر اردو مضامین شائع ہوتے ہیں۔ آپکی نثر کا نمونہ پیش ہے۔

"اب شکر کا مقام ہے کہ نظام صاحب ایک عام انسان کے درجہ پر پہنچ گئے ہیں اور عوام کے سروں سے یہ زبردستی کا تاج آتار پھینکا گیا ہے یکم نومبر کو عوام سجدہ شکرانہ بجالائیں گے جب میر عثمان علی خاں کی راج پرمکھی ختم ہوگی۔ میر عثمان علی خاں کی ذات سے کسی کو کیا اختلاف ہوسکتا ہے۔ مگر انکی سیاست ان کی روش اور ان کی پالیسی اسقدر گندہ مکروہ اور نفرت آمیز رہی کہ اہل حیدرآباد ایک لمحہ کیلئے بھی انہیں کسی سرکاری عہدہ پر دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔" (ملاپ یکم نومبر ۱۹۵۶ء)

(۶) رمن راج

رمن راج سکسینہ کایستھ قوم کے سپوت ہیں، آپ کے والد ستگرو پرشاد صاحب اور نانا حضرت باقی کا تذکرہ صفحات ماقبل میں کر دیا گیا ہے، رمن راج صاحب جامعہ عثمانیہ سے بی اے اور "یل یل بی" میں کامیابی حاصل کرکے وکالت کرتے ہیں، اپنے خاندانی روایات کے بموجب اردو ادب سے بڑی دلچسپی ہے، رسالہ "سب رس" کے (جو ادارہ ادبیات اردو کا ارگن ہے) ادارہ کے رکن ہیں، جسوقت وہ سٹی کالج اور پھر عثمانیہ کالج میں تعلیم پاتے تھے تو ہر دو کالجوں کے علمی رسالوں یعنی الموسیٰ اور مجلہ عثمانیہ کے ایڈیٹر منتخب ہوے اور اپنے زمانہ میں ان رسالوں کو اچھے اور بلند پایہ مضامین سے زینت دی تھی۔

(۷) منوہر راج سکسینہ

جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل، حیدرآباد کے سکسینہ خاندان کے مشاہیر ایڈوکیٹوں میں شمار ہوتے ہیں۔ محاذ کے لیڈر ہیں قومی کاموں سے بڑی دلچسپی ہے، آل انڈیا ایسوسی ایشن آف ڈیموکرالائرس کے جنرل سکریٹری ہیں، اپنے خاندان کے روایات پر اردو سے دلچسپی ہے، قومی کاموں کے ساتھ علمی کاموں سے شغف ہے۔

(۸) نرسنگ پرشاد صاحب جیسوال

جامعہ عثمانیہ کے بی اے یل یل بی، ایڈوکیٹ ہیں، اردو کے حامیوں میں شمار ہے، علمی اور تعلیمی مجالس سے شغف ہے۔

جیسا کہ قبل ازیں صراحت کردیگئی ہے کہ حیدرآباد اور حکومت حیدرآباد کے وکلاء جو اردو میں مقدمات کی پیروی کرتے رہے ہیں انکی تعداد سینکڑوں سے زیادہ ہے۔ اگر اضلاع اور تعلقات کو نظر انداز کرکے صرف شہر حیدرآباد کے وکلاء کے ناموں کی فہرست بنائی جائے تو سینکڑوں سے متجاوز ہوتی ہے اسلئے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

تبصرہ

اگرچہ دکن میں اردو زبان کے آغاز کا پتہ سنہ ۱۳۵۱ء سے ملتا ہے مگر نظم و نثر کے نمونے سنہ ۱۵۰۰ء سے ہم دست ہوتے ہیں، اس کتاب میں سنہ ۱۷۰۰ء سے ہندو شاعروں کا تذکرہ کیا گیا ہے اس طرح گویا ڈھائی سو سال کے شعرا اور ادیبوں کا حال صفحات گزشتہ میں پیش ہوا ہے، ابتدائی زمانہ کے جن شعرا کا ذکر کیا گیا ہے ان کی تعداد کم ہے، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس زمانہ میں ہندو شعرا اور ادیب نہیں تھے، بلکہ وجہ یہ ہے کہ ہم ان کے ناموں سے واقف نہیں ہیں، صرف تخلص معلوم ہوتا ہے، اگر ان میں ہندو اصحاب بھی ہوں تو کوئی تعجب نہیں ہے۔ کیونکہ شعرا کے تخلص میں کوئی خصوصیت ہندو مسلم کی نہیں ہوتی تھی اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ گولکنڈہ اور بیجاپور کے شعرا میں ہندو اصحاب بھی تھے جیسے رام راؤ اور سیوک جن کا پتہ خوش قسمتی سے مل گیا ہے، ممکن ہے آئندہ تحقیقات میں اس دور کے مزید ہندو شعرا کا پتہ چل جائے۔

جن شعرا کا تعارف صفحات گزشتہ میں کرایا گیا ہے ان کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے۔ اگرچہ یہ تعداد زیادہ نہیں ہے لیکن جب اس امر کا اندازہ کیا جائے کہ دکنی ہندو اصحاب کی مادری زبان تلنگی، مرہٹی، کنڑی رہی

ہے اس لئے جن شعرا کا تذکرہ ہوا ہے وہ ناکافی نہیں کہے جا سکتے۔ ۱۹۴۳ء میں جو مضمون قلمبند کیا گیا تھا اس میں صرف چالیس شعرا کا تذکرہ تھا اب ان میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔

ان شعرا کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اونہوں نے اپنے زمانہ کی فضا اور ماحول کے مطابق شاعری کی ہے، ان کی غزل میں وہ سب کچھ ہے جو غزل گو شعرا کا خاصا اور امتیاز رہا ہے، تصوف بھی ہے اور تغزل بھی، عشق و محبت کی داستاں بھی ہے، شاہد و ساقی کی حکایت بھی، شیخ و برہمن پر چوٹ بھی ہے اور کعبہ و دیر اور صنم خانہ اور بت بھی، یاس و حرماں کی تصویر بھی ہے، مسرت و سرور کی داستاں بھی معشوق کی رنگین داستاں بھی ہے اور بوسہ و کنار کی شرح بھی، ساتھ ساتھ فلسفہ و اخلاق کو بھی نظرانداز نہیں کیا گیا ہے۔

اونھوں نے مثنوی اور قصائد کے میدان میں بھی اپنے قلم کی جولانیاں پیش کر دی ہیں، قصائد کے پورے لوازم ان کے بیان میں موجود ہیں، رباعیوں میں انھوں نے اخلاق، فلسفہ، پند و نصیحت کا کافی سامان جمع کیا ہے، ان کے مرثیے رنج و الم کی پوری عکاسی کرتے ہیں۔ نظم نگاری بھی ان کی رہین منت ہے، اکثر شعرا کا کلام پسندیدہ اور بلند پایا ہے، انکے مضامین کا عمق خیالات کی گہرائی اور ندرت۔ تخیل کی بلند پروازی کلام میں نزاکت اور لطافت کے جوہر سب کچھ موجود ہیں کلام میں اثر ہے۔

شعرا میں قدیم اسکول کے بیسیوں شعرا ہیں تو جدید ترقی پسند شعرا بھی نظر آتے ہیں، ایسے باکمال شعرا کئی ہیں جن پر دکن کو فخر ہو سکتا ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کو جلا دی ہے، اور اپنے کلام سے اردو زبان کے ذخیرہ میں

کافی اور مفید اضافہ کیا ہے۔

شعرا کے مقابل اگرچہ نثر نگاروں کی تعداد کم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نثر نگاروں سے پوری طرح واقف نہیں ہیں آج سے پہلے نثر نگاروں کے حالات شعرا کے تذکروں کی طرح محفوظ نہیں کرتے تھے نثر نگاروں نے تاریخ، فلسفہ، اخلاق، سائنس، قانون، افسانہ وغیرہ مختلف فنون میں اپنے نقش قلم چھوڑے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ قائم ہو جانے کے بعد بیسیوں ہندو اصحاب نے نثر نگاری کے مختلف شعبوں میں بازی لگائی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہم کو اس کا پورا مواد نہیں ملا، یہ بالکل صحیح ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے کل فرزندوں کے لحاظ سے ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہے مگر ادبی خدمات میں اونہوں نے زیادہ زور قلم صرف نہیں کیا بلکہ انہوں نے قانون، طب، سائنس کے مختلف شعبوں میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیا ہے اس کی وجہ سے ادیبوں کا کم ہونا ناگزیر ہے۔

بریں ہم جامعہ عثمانیہ کے جن فرزندوں نے ادب کی جانب توجہ کی ہے اونہوں نے بہترین نقش پیش کئے ہیں مثلاً الہام، کنول، سکسینہ، شنکر موہن لال بھارت چند کھنہ، سری کشن سنہا وغیرہ۔

بہر حال دکن کے ہندو شعرا اور نثر نگاروں کے نام تاریخ اردو میں درخشاں ہیں ان کے کارنامے ہر آئینہ مستحق ستائش اور لائق داد ہیں، اونہوں نے اردو زبان اور ادب کی خدمت گزاری کا پورا حق ادا کیا ہے۔ جس کو کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے قلم کے شہ کار زندگی جاوید کے مستحق ہیں بلاشبہ دکن ان پر فخر کر سکتا ہے۔

اب آندھرا پردیش بن جانے کے باعث مہاراشٹر اور کرناٹک کے

حصے یعنے اورنگ آباد، گلبرگہ وغیرہ آندھرا پردیش سے علحدہ ہوگئے ہیں، مگر کرنول، کڑپہ، سدھوٹ مل گئے ہیں۔ اگر اس کتاب کی طبع ثانی کی نوبت آئے تو توقع ہے بہت کچھ اضافہ ہو سکے گا۔ مجھے خصوصیت سے نوجوانان وطن سے امید ہے کہ وہ اس کی جانب زیادہ توجہ کرینگے، پورے انہماک کے ساتھ جواں دل اور دماغ سے کام لیکر میرے ناتمام کام کو تکمیل کو پہونچائیں گے، اور اردو زبان کو زندہ رکھنے اور ترقی دینے کی پوری کوشش اور جد وجہد کرینگے کیونکہ اردو زبان صرف مسلمانوں کی ملک نہیں ہو بلکہ بقول سر تیج بہادر سپرو ہندو مسلمانوں کی مشترک میراث ہے جس کے دونوں حصہ دار ہیں اور دونوں کو اس کے باقی رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے، تاکہ انکے بزرگوں کی میراث تلف اور برباد نہ ہو جائے فقط

کٹل منڈی، حیدرآباد دکن
ذیقعدہ ۱۳۷۴ھ م جون ۱۹۵۵ء

ہاشمی

ضمیمہ ۱

شاعری (چھٹا دور)

جوہری لالہ مکند لال نام اور جوہری تخلص تھا، کاکوری ضلع لکھنو سے آکر حیدرآباد میں بس گئے۔ سررشتہ بندوبست میں مددگار ناظم تھے، اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے دیوان شائع کیا تھا، یہ دیوان ۱۳۲۶ھ میں مطبع فیض الکریم حیدرآباد میں طبع ہوا ہے، تحفہ جوہری اس کا نام ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

ذکر خدا کے واسطے لائیں کہاں سے اور ایک دل تھا وہ دے چکے عشقِ بتاں میں ہم

آتش دل بھی بجھائے نہ گئے اشکوں سے آنکھ کس برتے پہ کہتی ہے کہ دریا میں ہوں

ہم معتقد شیخ کے نہ پارسا کے ہیں ہو جن سے بندگی وہی بندے خدا کے ہیں

آسمان بن کے زمیں زیرِ قدم آتا ہے سر جھکاتا ہوں تو پھر عرس معلیٰ کیا ہے

سینکڑوں حسرت و ارمان و تمنائیں ہیں اور یہاں زیست کی دم بھر نہیں مدت باقی

تمہارے حسن میں ہم نورِ حق ہیں دیکھنے والے   نہ چھوڑو لن ترانی بھول جاؤ عہد موسیٰ کا

ملا تھا جوہری موسیٰ کو کوہ طور کا سرمہ   نہ آیا جب نظر میں ان کی جلوہ روئے زیبا کا

خاک میں حیف ملی حشمت شاہان کیا کیا   اہل ساماں ہوئے یاں بے سر و ساماں کیا کیا

ہوئی خواہش نہ زر کی جوھری کم   بہت تو پا چکے داغ جگر آپ

چمن سے غنچہ و گل کا وہ کارواں تو گیا   رہا ہے بلبل نالاں سے ایک جرس تنہا

بے پردہ گی سے اوسکی ہے خود رفتگی کا حال
موسیٰ کے دل سے پوچھئے بے پردگی کا حال

ڈاکٹر بی گوپال ریڈی

ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی نیلور کے ایک ذی وقار اور صاحب ثروت خاندان کے فرد ہیں۔ آپ ۵ اگست ۱۹۰۷ء کو پیدا ہوئے۔ آپکے والد ایک بلند پایہ عالم اور علم وفضل کے بڑے قدردان تھے ان کا گھر عالموں اور پنڈتوں سے آباد اور علمی مباحثوں کی دلچسپیوں سے معمور رہتا تھا ابھی آپ سات برس ہی کے تھے کہ والد کی شفقتوں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والد کے انتقال کے بعد آپکے بڑے بھائی کی سرپرستیوں نے آپکو اپنی آغوش تربیت میں لیا۔ انکے پاکیزہ کردار نیک شخصیت کے زیر اثر ڈاکٹر ریڈی نے اپنی شعوری اور علمی زندگی کا آغاز کیا اور ۱۳ برس کی عمر میں سرکاری مدرسہ چھوڑ کر ایک قومی مدرسہ میں شرکت کرلی۔ یہہ سیاست کے میدان میں غالباً پہلا قدم تھا۔ انکے بڑے بھائی اروبندو گھوش کے بہت معتقد تھے۔ اور اس تعلق کی بنا پر انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کو اعلیٰ تعلیم کے لیے کلکتہ بھیجا۔ ڈاکٹر ریڈی نے ۱۹۲۷ء میں شانتی نکیتن سے گریجویشن کیا۔ اسی شانتی نکیتن میں ڈاکٹر ریڈی کا علمی شوق اور شعری ذوق نکھرا اور آپکے دل کو وہ گداز نصیب ہوا جس کو شاعر اعظم ٹیگور کا اشیرواد سمجھنا چاہیے۔ تحصیل علم کے بعد آپ نے سیاسیات کو اپنی جولانگاہ عمل بنایا۔ ۱۹۳۰ء میں آپ کانگریس سے وابستہ ہوگئے۔ اس وابستگی کو سچے خلوص اور بے لوث جذبہ خدمت نے استوار کیا اور ارادہ کی استقامت کبھی راستہ کے نشیب وفراز کو ہموار کرتی گئی تو کبھی جیل کی دیواروں کو فرش راہ بناتی رہی۔ سیول نافرمانی کی تحریک کے سلسلہ میں آپ چھ بار جیل کی سختیاں اٹھا چکے ہیں۔ لیکن منزل کیطرف جو قدم اٹھ گئے تھے وہ ان آزمائشوں سے گزرتے ہوئے کہیں بھی نہ ڈگمگائے۔

اور منزل آپ کے خیر مقدم کو آگے بڑھ آئی۔

مدراس کی کانگریسی وزارت میں جو راجہ جی کی قیادت میں تشکیل پائی تھی۔ آپ ۳۹-۱۹۳۷ء تک وزیر لوکل گورنمنٹ رہے اس وقت آپ کی عمر صرف ۲۹ سال تھی اور آپ اس کابینہ میں سب سے جوان سال وزیر تھے۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں آپ دوبارہ مدراس اسمبلی کے لئے چنے گئے اور سنہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۲ء تک غیر منقسم صوبہ مدراس کے وزیر فینانس رہے اور سنہ ۱۹۴۸ء میں قاید ایوان بنائے گئے۔ ڈسمبر سنہ ۱۹۵۳ء میں آپ آندھرا پردیش کانگریس کمیٹی کے صدر چنے گئے۔ یہہ امتیاز بھی آپ کی عوامی مقبولیت کا ثبوت ہے کہ ریاست آندھرا کے فبروری سنہ ۱۹۵۵ء کے انتخابات میں آپ بیک وقت دو حلقہ ہائے انتخاب سے منتخب ہوئے اور ۲۰ر مارچ سنہ ۱۹۵۵ء کو باتفاق آراء متحدہ کانگریس لیجسلیٹیو پارٹی کے قاید چنے گئے اور ۲۸ر مارچ سنہ ۱۹۵۵ء کو چیف منسٹری کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ چیف منسٹری کے ساتھ ساتھ آپ کے ذمہ ایوان کی قیادت اور رہوم سرویز انتخابات تعلیمات اور بہبودی خواتین کے پورٹ فولیوز بھی تھے۔ قیام آندھرا پردیش کے بعد آپ نے ۳۰ر نومبر سنہ ۱۹۵۶ء کو وزیر داخلہ کی حیثیت سے حلف اٹھایا اور چند ہی ماہ بعد فینانس کا اہم اور کلیدی پورٹ فولیو آپ کے تفویض کیا گیا۔

چیف منسٹری آندھرا کے زمانہ میں ڈاکٹر گوپال ریڈی نے ریاست کی مالی حالت کو مستحکم بنانے کیلئے موثر تدابیر اختیار کیں اور عوام کی ہمہ جہتی ترقیات کیلئے نئی نئی راہیں کھولدیں۔ آپ نہ صرف ایک بیدار مغز مدبر اور دردمند لیڈر رہیں بلکہ علم و ادب کا بہت نفیس اور اعلیٰ ذوق بھی آپ کو ملا ہے۔ تلگو کی ادبی ترقیوں کو آپ کی سرپرستیوں پر ہمیشہ ناز رہے گا۔ آپ تلگو بھاشا سمیتی مدراس کے پریزیڈنٹ ہیں اور تلگو کی انسائیکلوپیڈیا کی تدوین آپکی ادبی رہنمائیوں کا ایک درخشاں کارنامہ

ہے۔ ٹیگور کے متعدد شہ پاروں کو آپ نے بنگالی زبان سے تلگو میں منتقل کیا ہے بحیثیت چیف منسٹر و وزیر تعلیم آندھرا آپ سری وینکٹیشورا یونیورسٹی ترو پتی کے پرو چانسلر رہے اور اپنی ادبی صلاحیتوں اور علم پرور سرپرستیوں کے اعتراف میں آندھرا یونیورسٹی نے، جس کے آپ سنہ ۱۹۵۱ء سے سنہ ۱۹۵۷ء تک پرو چانسلر رہے، آپکو ڈاکٹر آف لٹرز کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ حال حال ہی میں آندھرا پردیش کے شاعر اعظم شری کرشنا موتی شاستری نے وویا بھوشن کے لقب سے آپ کے علمی شغف کو ایک اور امتیاز بخشا ہے۔

ڈاکٹر ریڈی کو ہندستان کی ساری زبانوں سے دلچسپی ہے اور ان کی یہ دلچسپی سرسری واقفیت ہی سے آسودہ ہو کر نہیں رہجاتی بلکہ وہ جس زبان کو بھی زیر مطالعہ لاتے ہیں محققانہ انداز میں اصولی ترکیبوں اور لطیف نزاکتوں کی گہرائیوں تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ آپ کے وسیع النظر ذوق ادب نے علم و وجدان کو زبان کی حدبندیوں سے آزاد کر دیا ہے۔ حیدرآباد کی اردو فضاؤں نے تو ڈاکٹر ریڈی کا دل اسطرح موہ لیا ہے کہ آپ یہاں کے اردو شاعروں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی میں حقیقی شادمانی محسوس کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ریڈی نہ صرف ادب پرست ہیں بلکہ حیدرآباد کی تہذیب کے بھی دلدادہ ہیں۔

یہ تخلیق کا شہکاری کرشمہ ہے کہ اس نے ڈاکٹر ریڈی کی ذات میں سیاست انسانیت ادب اور شعریت کا ایک ایسا نادر امتزاج رکھدیا ہے کہ ان کی شخصیت کے سحر کو چاروں سمتوں سے خراج عقیدت پیش ہوتا ہے۔ حیدرآباد کا دل اپنی ترسی ہوئی آرزوں کے ساتھ ڈاکٹر ریڈی کے خیر مقدم ہی کیلئے دھڑک رہا تھا۔ حیدرآباد میں مہاراجہ کشن پرشاد جس طرح اپنی علم دوستی، بے تعصبی، خوش اخلاقی اور فروتنی سے ہر دل عزیز تھے، اسی طرح ڈاکٹر گوپال ریڈی تو قع ہے کہ ان کے نعم البدل ثابت ہونگے۔ آپ کی اردو نثر کا نمونہ پیش ہے جو جامعہ عثمانیہ کے یونین کے جلسہ

میں صدر کی حیثیت سے خطبہ سنایا گیا تھا۔

"میں ابھی ابھی حیدرآباد آیا ہوں۔ یہاں کی تہذیب کے لیے نیا ہوں، لیکن اردو سے میری پرانی دوستی ہے، اردو کا مجھے بہت دن سے شوق ہے، جب میں جیل گیا۔ میں وہاں اردو سیکھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن جو کچھ سیکھا تھا جیل سے باہر نکلتے ہوئے جیل والوں ہی کو دے ڈالا تھا، اور اردو سے بھی رہائی پا لیتا تھا۔ ۱۹۳۰ء، ۳۲ء، ۴۰ء، اور ۴۲ء میں ایسا ہی ہوا۔

اب میں حیدرآباد میں حاضر ہوں اور جو کچھ یہاں سیکھ رہا ہوں اُسے نہ جانے موسیٰ ندی کے سیلاب میں ہی بہا دینا پڑے یا زندگی کے سفر میں اپنا ہم سفر بنا لینا پڑے آیندہ کا حال خدا جانے۔ مجھے امید تو ہے کہ اس دفعہ اردو مستقل طور پر ہی میرے ساتھ رہے گی مجھے خوشی ہے کہ حیدرآباد کے ادبی ماحول کو دیکھ کر میں نے اردو الف ب سے نہیں شروع کی بلکہ اردو شاعروں کے بادشاہ مرزا غالبؔ کو اپنا پہلا غائبانہ استاد بنایا۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے مگر میں سچ کہہ رہا ہوں بقول غالبؔ —

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

اردو شاعری سے مجھے بہت دلچسپی ہے اور میں اردو سیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں .... اردو شاعری میں مجھ کو بہت لطف ملتا ہے چاہے وہ عشق حقیقی ہو یا عشق مجازی۔ مگر وہ عشق ہی ہے، اس عشق کے بارے میں بہت نزاکت سے بہت لطافت سے اور کہیں کہیں شرارت سے شاعروں نے بہت کچھ کہا ہے، معشوق خدا ہے یا گرو ہے یا کوئی حسین مہ جبین، دل شکن نازنین خدا جانے مگر ہے وہ معشوق، اور وہ ہمارے لئے کافی ہے۔" (اخبار ریاست)

اشاریہ

(ز)

(س)